کوئی بادزن کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، آیندہ اڈیشن میں الذین احسنوا الحسنیٰ اور زیارت (ص ۹۷) کی اس طرح ضرور تصحیح کر لی جائے للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ۔ یہ قرآن مجید کی آیت ہے۔

تصورِ آخرت اور ہندوستانی روایات:- مرتبہ جناب محمد فاروق خانصاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۵۶، قیمت ایک روپے پچاس پیسے، پتہ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی۔ ۶۔

گو عقیدۂ آخرت اسلام کا خاص امتیاز ہے، مگر یہ تصور دوسرے مذہبوں اور قوموں میں بھی موجود تھا اور اب بھی انکی قدیم کتابوں سے اسکے آثار محو نہیں ہوئے ہیں، اس مختصر کتاب میں ہندو مذہب کی قدیم کتابوں اور ہندوستانی روایات کا جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ ان میں بھی آخرت کی جھلک پائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں آخرت کے مخالف عقائد کی تردید بھی کی ہے اور ہندوستان میں رائج بعض عقائد آواگون وغیرہ کو خود ہندو مذہب کی کتابوں کے حوالے سے باطل قرار دیا ہے، پھر موت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت، دوزخ اور میزان عمل وغیرہ کے متعلق قدیم ویدوں، شاستروں، پران، مہابھارت، گیتا اور اپنشد وغیرہ مختلف مذہبی کتابوں میں جو کچھ صراحت اور ثبوت موجود ہے، اسے انکے حوالہ سے تحریر کیا ہے، یہ رسالہ مرتب کر کے مصنف نے ایک بہت مفید دینی و تبلیغی خدمت انجام دی ہے، جو ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کئے جانے کے لائق ہے۔

وصایا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ:- انتخاب و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۲، قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے، پتہ کتب خانہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ۔

مشہور امامِ طریقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا کا ایک قلمی نسخہ کتبخانہ مدرسہ فیض الاسلام پہلت میں موجود تھا جو حسن اتفاق سے مولانا نسیم احمد فریدی کی نظر سے گذرا، وہ اہل اللہ اور بزرگوں کے ارشادات و فرمودات کے بڑے قدرداں اور سلوک و معرفت کے خاص لذت آشنا ہیں، اسلئے انکی کوشش و توجہ سے حضرت سہروردیؒ کی وصیتوں کا ترجمہ و تلخیص پہلے ماہنامہ الفرقان میں قسط وار شائع ہوا، اور اب کتابی صورت میں چھپا ہے، گو حضرت سہروردیؒ نے یہ وصیتیں اور نصیحتیں اپنے بعض مریدین، خلفاء اور متعلقین کو کی تھیں، مگر ان میں عقائد و اخلاق اور اعمال و کردار کو سنوارنے کی تلقین اور تصوف و عرفان اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کا بیان بھی ہے اور سلسلۂ سہروردیہ کی بعض امتیازی باتوں کا تذکرہ بھی ہے جن کے مطالعہ سے ہر شخص کو فائدہ ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۳۲ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۳ء عدد ۵

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

مستشرقین کی خدمات اور اُن کے حدود — جناب سید وحید الدین صاحب، ہمدرد نگر، نئی دہلی — ۳۲۵-۳۳۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعر و سخن کی قدردانی — عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین — ۳۳۸-۳۵۱

ایک بین الاقوامی سمینار کے سلسلہ میں لندن کی ڈائری — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ۳۵۲-۳۹۰

وفیات

معین الدین حارث — جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب (پٹنہ) — ۳۹۱-۳۹۳

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۳۹۴-۴۰۰

شذرات

ستمبر ۱۹۸۳ء کے معارف کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ ہمارے بعض مورخین مسلمان حکمرانوں کے عہد کی مندر شکنی کا اشتعال انگیز ذکر کرکے ہماری قومی یکجہتی کو نقصان پہنچا رہے ہیں، کیونکہ اگر اس زمانہ میں مندر منہدم ہوئے تو مسجدوں کے شہید کئے جانے کی بھی بکثرت مثالیں ہیں،

اس تحریر کو پڑھ کر جہاں اور خطوط آئے، اُن میں مرادآباد سے جناب مولانا افتخار فریدی نے یہ مکتوب لکھ کر نوازا ہے :-

"ستمبر کے معارف میں آپ نے مندروں کے انہدام کی تلبیس پر جس طرح قلم اٹھایا، اس سے جی بڑا خوش ہوا، آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، مرادآباد کے ایک سابق وزیر برابر یہ بیانات دیتے رہے کہ جن مندروں کو مساجد میں تبدیل کیا گیا تھا ان کو واپس کر دیا جائے، تو ہندو مسلم دشمنی اور فسادات ختم ہو جائیں گے، ماشاء اللہ آپ نے تاریخ سے بڑا جاندار ثبوت مہیا کیا ہے کہ ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے بھی بہت سی مسجدوں کو ڈھایا، دہلی میں اکبرآبادی مسجد جامع مسجد کے نزدیک دہاں پر تھی جہاں ایڈورڈ پارک ہے، یہ ڈھا دی گئی، دہلی جنکشن اسٹیشن کے پاس اورنگ آبادی مسجد تھی، وہ بھی ڈھا دی گئی، لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان موتی خانم کا بازار تھا، اس میں ۳۶ مسجدیں تھیں، وہ سب منہدم کر دی گئیں، اس موضوع پر جتنی معلومات تاریخ سے مہیا ہو سکیں، وہ انگریزی اور ہندی میں بھی طبع کرائی جائیں، یہ کام کتبخانۂ اسکندریہ کی طرح ہوگا"

اس موضوع سے ہمارے جن مورخین کو دلچسپی ہو امید ہے کہ اس پر تفصیلی معلومات فراہم کرکے اس مکدر فضا کو دور کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہمارے قومی بہاؤ کو نقصان پہونچ رہا ہے،

علامہ محمد اقبالؒ پر دوسری بین الاقوامی کانگریس ۱۰ / ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء کو لاہور میں ہو رہی ہے،

اس میں شرکت کرنے کا ارادہ ہے، اس شاعرِ مشرق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے آئندہ بھی لکھا جائیگا، اور جتنا بھی لکھا جائے گا، کمی محسوس ہوگی، مگر انھوں نے جو پیام دیا تھا، اس پر عمل ہوا بھی کہ نہیں، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے خوابِ گراں سے بیدار ہوں، وہ ناموسِ ازل کے امین، جبریل و اسرافیل کے صیاد، ظاہر و باطن کی خلافت کے سزاوار، زہر کا تریاق، مہر و مہ و انجم کے حاکم، خود نگر، خود گر، خود گیر، بانگ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم بن کر رہیں، مگر خود انھوں نے اپنی زندگی میں محسوس کیا کہ وہ مسلمانوں کو کچھ نہ بنا سکے، اس لئے بارگاہِ رسالت میں فریاد کی،

بآں رازے کہ گفتم پے نبر دند	ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میر الامم داد از تو خواہم	مرا یاراں غزل خوانے شمردند

علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس ہو یا ان کی سالگرہ کا جشن ہو یا ان پر سمینار ہو، اگر ان کے پیام پر عمل نہ ہو تو ایسے اجتماع کے دھوم دھام اور تزک و احتشام کے اندر ان کی روح منڈلاتی ہوئی کہہ رہی ہوگی،

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات	فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

کراچی یونیورسٹی سے ایک دعوت نامہ آیا ہے کہ اس سال پاکستان کے مشہور مصنف جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم کے سلسلۂ توسیعی لکچر کا دوسرا لکچر اس راقم کا ہو، اس لئے کہ میرا ان سے گذشتہ پچیس برس سے بڑا گہرا تعلق رہا، وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں بلکہ محسن تھے، اس سلسلہ کا پہلا لکچر مشہور جرمن خاتون اینی میری شمیل کا تھا، خاکسار نے اپنے مقالہ کے لکھنے میں پوری کوشش کی ہے کہ ان کا جو علمی پایہ اور رتبہ تھا، وہ صحیح طور پر متعین ہو جائے،

انھوں نے قانع ٹھٹوی کی مقالات الشعراء، یوسف میرک کی تاریخ شاہجہانی، میر محمد ٹھٹھوی کی تاریخ ترخان نامہ، میر محمد معصوم بھکری، میرزا محمد اصلح کی تذکرۂ شعرائے کشمیر اور فخری ہروی کی تذکرہ

روضۃ السلاطین و جواہر العجائب اور دوسری تصانیف کو ایڈٹ کرنے میں جو تعلیقات اور حواشی لکھنے کا اہتمام کیا، وہ ایک ایسا اونچا آرٹ بن گیا ہے جس کو ارفع تر کوئی اور اہل قلم شاید ہی بنا سکے،

ان کی علمی زندگی کے دو بڑے مقصد تھے، ایک تو یہ کہ علم کی تلاش میں تن آسانی، سہل انکاری، کوتاہ قلمی، گریز، فرار، اور چشم پوشی کو علم کی شریعت میں معصیت قرار دیا جائے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ سندھ کی گذشتہ علمی عظمت، فضیلت و جلالت کو سامنے لاکر اس کو وہ مقام عطا کیا جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہو، ٹھٹھہ سندھ کا دار السلطنت رہا، وہاں جو آثار قدیمہ ہیں ان کی ہر چیز سے مرحوم کو عشق رہا، ان کی شاید دلی خواہش تھی کہ اس شہر کے تمام آثار کی تاریخ اس طرح قلمبند کی جائے کہ یہ معلوم ہو کہ یہ پایہ تخت بھی غرناطہ، بغداد، غزنیں اور دہلی سے کم نہیں رہا، انھوں نے مختلف کتابوں کو ایڈٹ کرتے وقت سندھ سے متعلق اتنا تاریخی، ادبی، اور شعری لٹریچر فراہم کر دیا ہے کہ اس میں وہی سب کچھ نظر آتا ہے جو سندھ کے گذشتہ زمانہ میں تھا، ان کے اس کارنامہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے،

نیا دور لکھنؤ کا ایک بہتم بالشان نمبر فراق گورکھپوری پر شائع ہوا ہے، فراق گورکھپوری اپنے دور کے تمام المتغزلین تھے، ان کو نابغۂ روزگار، اقلیم سخن کا شہنشاہ، حسن و عشق کا پیامبر، اردو شاعری کی شاندار روایت کا وارث، ذوق جمال اور احساس جمال کا رازداں اور آفاقی بصیرت کا رمز شناس جو کچھ بھی کہا جائے صحیح ہوگا، ان کے رتبے اور پایے کو متعین کرنے کے لئے نیا دور کے اڈیٹر امیر احمد صدیقی صاحب نے جو ان کا شاندار نمبر نکالا ہے وہ اردو رسائل کی تاریخ میں ایک زریں مثال ہے، ہندوستان کے مختلف اہل قلم سے مضامین لکھوا کر جمع کرنا، پھر خوش سلیقگی سے ان کو ترتیب دینا، اور اعلیٰ کتابت، طباعت، اور گرد پوش کے ساتھ شائع کرنا، فراق گورکھپوری کی شاعرانہ عظمت و جلالت کے پورے شایان شان ہے، اس کے لئے امیر احمد صدیقی صاحب اور ان کے اسٹاف کے رفقاء ہر طرح کی ستایش اور مبارکباد کے مستحق ہیں، اس ۲۵۶ صفحے کے ضخیم نمبر کی قیمت ڈیڑھ روپیے ہے، گویا کوڑیوں کے مول میں شعر و ادب کی ایک بڑی دولت لٹائی گئی ہے

مقالات

مستشرقین کی خدمات اور اُن کے حدود

از جناب سید وحید الدین صاحب، ہمدرد نگر، نئی دہلی،

"یہ مضمون دار المصنفین کے بین الاقوامی سمینار "اسلام اور مستشرقین" ہی کے لئے لکھا گیا تھا، جو سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" نئی دہلی میں چھپ چکا ہے، لیکن اس سلسلہ کو مکمل کرنے کیلئے معارف میں بھی اسے شائع کیا جا رہا ہے۔" (معارف)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی عالموں نے علوم اسلامی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، بہت سے مخطوطات جو دور دراز کتب خانوں میں پوشیدہ تھے، ان کا سراغ لگایا، سائنٹفک طریقہ سے اُن کو ایڈٹ کیا، اور دُنیائے اسلام سے ان کو روشناس کرایا، آج بھی مسلمان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کام کیا ہے، کیا باعتبار مقدار اور کیا باعتبار معیار، اُن کا مجموعی طور پر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عالم جب کسی دوسری تہذیب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان روایات اور تعصبات سے اپنے کو منزہ نہیں کر سکتا جن میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ اس طرح ہر تہذیب کا علمبردار اپنے ساتھ اپنی ہی تہذیب کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، اور

اپنی ہی روایات کی روشنی میں دوسری تہذیب کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔
مستشرقین کا اسلام کے ساتھ معاملہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین
عام طور پر یا تو یہودی النسل رہے ہیں یا پھر عیسائیت سے وابستہ رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں نے ایک معاندانہ
فضا پیدا کر دی تھی جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات اس طرح شروع
سے ایسے ماحول میں نشو و نما پاتے رہے جو اسلام کی صحیح تفہیم کے لیے بالکل ناسازگار تھا۔ خاص طور پر
رسول اللہ ؐ کی سیرت کذب و افتراء کا نشانہ بن گئی۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلو بھی ہیں جن کا براہ راست
مذہب سے تعلق نہیں۔ جیسے فن تعمیر، شعر و شاعری، مصوری (خاص طور پر خطاطی) وغیرہ اور
سائنسی علوم جیسے ریاضی، ہیئت، بصریات، تاریخ وغیرہ، ان علوم کے بارے میں مستشرقین کا کام
بڑی حد تک مذہبی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ جرمن مستشرق زخاؤ نے البیرونی کی کتاب الہند کو
ایڈٹ کیا۔ البیرونی کی اہمیت کا احساس اسی زمانہ سے دن بدن بڑھتا گیا۔ اسی طرح ابن خلدون کا
کارنامہ بہت بڑی حد تک مستشرقین ہی کی کاوشوں سے ہمارے سامنے آیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ
تاریخ کے عمرانی شعور کا سرچشمہ اسلامی فکر و نظر میں ملتا ہے۔ اصل مشکل اس وقت آ پڑتی ہے جب ہم
دینیاتی مسائل، قرآن حکیم اور رسول اللہ ؐ کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں پہلے تو اس بات کا
کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیے کہ مذہبی معاملات میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے متعلق
ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ لوگ بغیر فضل الٰہی کے ان سے اتفاق کر سکیں۔ لیکن ہم یہ ضرور توقع
رکھ سکتے ہیں کہ وہ قیاس آرائیوں اور امکانات کو اپنے حدود میں رکھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ
مستشرقین نے اکثر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ جہاں کوئی امکان سلبی نوعیت کا رہا اس کو انھوں نے دوسرے
امکانات پر غلبہ دے دیا۔

مستشرقین کے اس رویے کی ایک افسوسناک مثال بنی قریظہ کے واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔
جہاں اس واقعہ کے بیان میں تخیل کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ یہاں میرا اس واقعہ کی نوعیت یا اصلیت سے
بالکل سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مورخین کا کام ہے کہ وہ اس کی صحیح طور پر جانچ کریں۔ یہاں یہ بتانا
مقصود ہے کہ جہاں رسول اللہ ؐ کے صحابی سعد بن معاذ ؓ کے حکم بنائے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں بول
(BUHL) جیسے مستشرقین نے اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ سعد ؓ کا فیصلہ رسول اللہ ؐ کے ایماء پر ہوا ہوگا۔
مورخ تاریخ میں امکانات کا لحاظ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ایسا امکان جس کا نشانہ ایسی
شخصیت ہو جس کے تقدس کے سہارے کروڑوں مسلمان اپنی روحانی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔
انتہائی افسوس ناک ہے۔ ایک سے زیادہ مستشرق نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے تو رسول اللہ ؐ
کو یہودیوں سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو آپ نے قبلہ کا رخ
بدل دیا۔

بعض دیانت دار مغربی عالموں نے مستشرقین کے "حدود" کا خود ہی اعتراف کیا ہے۔ اور برنارڈ لیوس
نے اپنے ایک مضمون "اسلام" کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

"یہ کہا گیا ہے کہ عربوں کی تاریخ یورپ میں خاص طور پر ایسے مورخین نے لکھی۔ جو عربی
سے نابلد تھے یا ایسے عربی دانوں نے لکھی جو تاریخ سے نابلد تھے۔" یہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ
ایسے علوم و فنون جن سے کوئی فنی صلاحیت کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ان فاضلوں کے ہاتھ
میں رہے جو متعلقہ علم و فن سے بالکل ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے فلسفیانہ فکر کی
جو خدمت انجام دی ہے اسکے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ ارسطو کے صرف نقال اور ناقل رہے
ہیں، چونکہ مغربی فلسفہ کی تاریخ میں عیسائی علم کلام کو عرصہ تک کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اسلیے مسلمانوں کے تفکر اور
انکے علم کلام کے سلسلہ میں انکی خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اور اب یہ آہستہ آہستہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہ صرف

عیسائی علم کلام مسلمانوں کے تفکر کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض بنیادی تصورات ایسے بھی مسلمان فلاسفہ نے پیش کئے جن کا اثر فلسفیانہ تفکر پر کافی رہا۔ ابن رشد کے علاوہ ابن طفیل نے جو تعلیم کا خاکہ اپنے فلسفیانہ رومانس حی بن یقظان میں پیش کیا ہے۔ وہ فلسفہ تعلیم کے مباحث میں اب قابل توجہ بن گیا ہے۔ اور یہ سوال کہ خدا کا تصور کہاں تک وہبی ہے۔ اور کہاں تک اکتسابی، ایسا سوال ہے۔ جس کی صدائے بازگشت ہم کو دیکارٹ اور لائبنز کے فلسفہ میں ملتی ہے۔ یہی حال تصوف کا ہے۔ ابتداء میں تو مستشرقین تصوف کے ماخذ دوسرے مذاہب میں ڈھونڈتے رہے۔ کسی نے فنا کے تصور کو بدھ مذہب کے نروان سے جوڑنے کی کوشش کی، اور کسی نے صوفیانہ تصور توحید کو ویدانت سے ملانے کی کوشش کی، لیکن اب میسنون کی سرکردگی میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو قرآن ہی میں تصوف کی بنیادیں تلاش کرتا ہے۔ اور اس کو خاص اسلامی مظہر قرار دیتا ہے گو کہ یہ بات بھی واضح ہے کہ تاریخ تصوف میں بہت سی بے راہروی رہی ہے۔ اور کیفیات سے مغلوب صوفیہ کی زبان سے ایسے الفاظ بھی صادر ہوئے جن کو شریعت کے مغائر سمجھا گیا لیکن ان کی تمام باتوں کے باوجود تصوف کا بنیادی مزاج تسلیم و رضا رہا ہے۔ اور قرآن ہی کے تصور احسان کو ایک بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مستشرقین سب ایک طرح کے نہیں رہے، بلکہ بعض ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود کھلے دل سے اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی روحانیت اور وہ ادب جو عیسائی روحانیت سے متاثر ہے۔ اسلام کے اثرات کو بیّن طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مقام ہسپانوی مستشرق پروفیسر اسین پلاسیوس (ASINPALACIOS) کا ہے جس نے امام غزالیؒ پر سب سے جامع کتاب لکھی، اگرچہ اس نے اپنی کتاب کا نام کچھ ایسا رکھا ہے۔ جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کا جو شعور تھا، وہ اسلام سے زیادہ عیسائیت کے زیادہ قریب ہے۔ اس نے غزالی کے صوفیانہ شعور کو مسیحی شعور کی مثال سمجھا، لیکن سب سے بڑا نمایاں کام اس نے یہ کیا کہ مغربی ادب اور خاص طور پر دانتے کے شاعرانہ شاہکار طربیہ سرمدی میں اسلامی اثرات کا کھوج لگایا جس سے مغرب کے ایک خاص طبقہ میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ اس نے اپنی کتاب ..... ST. JOHN OFTHECROSSANDISLAM میں اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ عیسائی زہد اور باطنی زندگی کے علمبردار اس حد تک اسلام سے متاثر ہوئے کہ اس حلقہ کی اصطلاحات میں ہسپانوی صوفی ابن عباد کا اثر ملتا ہے، اور یہاں ہم کو خالص صوفیانہ تمثیلات ملتی ہیں۔ بہر صورت ان کی تصانیف اور ان کے بنیادی خیالات سے متعلق ہمارا ردعمل کیسا ہی سلبی کیوں نہ ہو، ان کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ جن کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اگر کوئی شخص مسلمان یا غیر مسلم، اسلام کے ادب و مزاج کا جائزہ لینا چاہے تو اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اب میں ان تحدیدات کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے مغربی انداز فکر بری طرح متاثر ہے یہاں کوئی تفصیلی جائزہ تو پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نہ تو میں مورخ ہوں نہ کوئی اسلامیات کا طالب علم۔ اس لئے میں ایک مختصر تبصرہ ایک اہم کتاب کے بعض مضامین پر پیش کروں گا جس سے مستشرقین کی خدمات اور ان کی تحدیدات دونوں اچھی طرح سامنے آجائیں گی یہ کتاب مشہور جرمن مستشرق رودی پارٹ (RUDI PARET) کی مرتب کردہ ہے، اس کا نام القرآن ہے۔ اس میں پارٹ نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ جو قرآن سے متعلق مغرب میں لکھے گئے زیادہ تر مضامین جرمن زبان میں ہیں۔ اور بعض انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہیں۔ یہاں ہم کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ پارٹ کا اور ان کے رفقاء کا اسلام کے متعلق کیا زاویہ نگاہ ہے۔ اور کس حد تک یہ مقولہ کہ العلم حجاب الاکبر اُن پر صادق آتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں

ایک ایسے مستشرق کا بھی مضمون ہے جس میں اس نے اپنے مذہبی رفقاء کے خلاف بڑے موثر انداز میں اپنی آواز بلند کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی تحقیق ابھی تک ان تعصبات سے خود کو آزاد نہیں کر سکی ہے۔ جو رسول خدا صلعم کی شخصیت اور اسلام کی مذہبی بنیادوں کے متعلق ان کو ورثہ میں ملے ہیں اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جن غیر مسلم محققین کا جغرافیائی دائرہ اسلام اور عیسائیت کی کشمکش سے باہر ہے ان کی تصانیف کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ مثلاً جاپانی عالم اِزُتسو (IZUTSU) نے جو کچھ اسلامی تصوف اور دینیاتی تصورات کے متعلق سپرد قلم کیا ہے وہ ان طریقہ ہائے کار سے بالکل ہٹا ہوا ہے جن پر مغربی فکر گامزن رہی ہے، اس امر کا پروفیسر برنارڈ لیوس نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

"مغربی دینیاتی تعصبات کی آخری نشانیاں اب بھی بعض مغربی فضلاء کے پاس ملتی ہیں جو علمی خول اوڑھے ہوئے حواشی میں ظاہر ہوتی ہیں"۔

پروفیسر پارٹ کی مرتب کردہ کتاب میں جو مضامین جمع کئے گئے ہیں وہ اس کا بین ثبوت ہیں کہ کیوں قرآن ہمیشہ مغربی فاضل کے لئے ایک کتاب مختوم کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔

پارٹ کا لکھا ہوا آربری کے قرآن کے ترجمہ پر تبصرہ قابلِ توجہ ہے۔ آربری مسلم روایت کا احترام کرتے ہوئے اس کو ترجمہ کا نام نہیں دیتے بلکہ وہ اسے "ایک تعبیر" قرار دیتے ہیں، اور مغربی علماء کی قرآن کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوششوں کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ آربری کے نزدیک گو کہ وحی کا نزول بیک وقت نہیں ہوا لیکن ان چیدہ چیدہ پیامات الٰہی کو بہ حیثیت کل کے دیکھنا ہوگا۔ جب آربری نے قرآن کے انگریزی ترجمہ کو "تعبیر" کا نام دیا تو پارٹ نے اس کو مسلمان دوستوں کی خوشنودی کے حصول کا وسیلہ

قرار دیا۔ یہ جرمن فاضل یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ خود ترجمہ کی کوشش ایک مشکوک عمل ہے، خود قرآنی متن کے متعلق نہایت ہی معاندانہ مشاہدات سے گریز نہیں کرتا۔ قرآن کا کوئی مترجم اس کو نظرانداز نہ نہیں کر سکتا کہ قرآن اس معنی میں "کتاب" نہیں ہے۔ جس معنی میں کتابیں ہمارے کتب خانوں کی زینت بنتی ہیں۔ قرآن نہ صرف ایسی "کتاب" ہے جو پڑھی جاتی ہو بلکہ وہ قابل تلاوت و قرأت بھی ہے۔ اور یہ چیز ترجمہ میں نہیں پیدا ہو سکتی، اسی کتاب میں بول کا بھی ایک مضمون قرآنی مماثلتوں اور مقابلتوں (SIMILARITIE SANDCOMPARISIONS) پر ہے۔ جو بہت قابل توجہ ہے۔ وہ اپنی توجہ خاص طور پر سورۂ نور کی آیات پر مرکوز کرتے ہیں۔ وہ یقینی طور پر یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ کیا واقعی یہ آیات روحانی معنویت اور عمق کو ظاہر کرتی ہیں یا نہیں۔ ان کو بس اتنا یقین ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عیسائی راہبوں کی صحرائی خلوت گاہوں میں جو چراغ روشن دیکھے تھے انھوں نے ان پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ قرآن میں بطور تشبیہ کے ان کا استعمال کیا گیا۔ وہ یہ تو مانتا ہے کہ یہاں جو مثال پیش کی گئی ہے۔ وہ قابل توجہ اور انوکھی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح سے اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اس کتاب کا مرتب ایک ممتاز جرمن عالم ضرور ہے۔ اور اس کا قرآن کا جرمن ترجمہ مستشرقین کے نزدیک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ تاریخی طرز تحقیق کا بڑا علم بردار ہے۔ حالانکہ اس طریقۂ کار پر حال میں مغربی فضلاء نے بڑی سخت تنقید کی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی سوسائٹی اور نظامِ حیات کے اقدار کو نظرانداز کر کے ہم اس تہذیب کے مزاج کو سمجھ نہیں سکتے اور صرف تاریخی کھوج سے ہم صداقت کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برسوں کی تحقیق اور کاوش کے بعد پارٹ کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامیات سے متعلق مغربی علماء کی تحقیق نے جو نتائج پیش کئے ہیں وہ بنیادی طور پر صحیح اور معروضی ہیں۔ اور

اب اگر کسی تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے تو اس کی صرف ضمنی حیثیت ہوگی۔ اب ایسے سنسنی خیز نتائج پیش ہونے کی مستقبل میں توقع نہیں کی جاسکتی جن سے پچھلے نتائج کا ابطلان ہوسکے۔ ہاں پارٹ کی تحقیق نے ایک سنسنی خیز نتیجہ تو ضرور پیش کیا ہے۔ اس کے انکشاف کے مطابق قرآن نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کے اٹھائے جانے کا قائل ہے۔ بلکہ اس کا بھی کہ ان کی مقدس ماں بھی آسمان پر اٹھالی گئیں اور ساتھ ہی پارٹ کے کہنے کے مطابق رسول اللہؐ کو یہ بھی یقین تھا کہ "ایام اواخر" میں حضرت مریمؑ کا ظہور ہوگا۔ بعد میں اسی خیال کی تائید میں ایک دوسرے محقق ہیننگ (HENNING) کا ایک پورا مقالہ دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خیال کہ حضرت مریمؑ آسمان پر اٹھالی گئیں۔ کیتھولک کلیسا کا ایک عقیدہ بن گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عجیب سے مفروضہ کی کیا بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹ اور ہیننگ دونوں "دوستانہ مراسلت" کے ذریعہ ایک دوسرے سے فیضیاب ہوئے۔ اُن کے دعوے کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ
مِنَ اللّٰهِ شَيْــــًٔـا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ
يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵ - ۱۷)

اس آیت سے ہیننگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ دونوں کو زندہ تصور کیا گیا۔ اور یہ بھی تصور کیا گیا ہے کہ دونوں عالم سماوی میں زندہ موجود ہیں اور اسی لئے پیغمبر اسلامؐ حضرت مریمؑ کی اس عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کے قائل تھے۔ اس عقیدے میں ہیننگ کو مشرقی کلیسا کے عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کو یہ بات قابل لحاظ معلوم ہوتی

کہ حضرت مریمؑ کا ذکر حضرت مسیحؑ کے ساتھ ساتھ کیا گیا۔ اور یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نہ صرف حضرت مسیحؑ بلکہ حضرت مریمؑ کی بھی عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارے فاضل محقق رقم طراز ہیں: "شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ پہلے حضرت مسیحؑ کو ابن مریم کہا گیا یا شاید حضرت مسیحؑ کے تسلسل حیات کا خیال ان کے ذہن میں حضرت مریمؑ کے تسلسل حیات کے تصور کا محرک بنا۔ ان دو امکانات میں وہ دوسرے امکان کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کا فیصلہ کن ثبوت وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے مشرقی کلیسا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سارے نظریہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کس طرح عیسائی اثر قرآنی تصورات میں عمل پیرا رہا۔ حالانکہ سیدھی سادھی توجیہ تو یہ ہے کہ یہاں قرآن کے پیش نظر نہ حضرت مسیحؑ کی اور نہ حضرت مریمؑ کی مخصوص حیثیت ہے۔ بلکہ اس کا اصرار تو صرف قدرت الٰہی پر ہے جو کسی ارضی مخلوق کے متعلق کوئی استثنا روا نہیں رکھتی، خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ جب قرآن حضرت مسیحؑ اور ان کی ماں کا ذکر کرتا ہے تو ان کا ذکر تمام ارضی مخلوقات کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس کا تعلق ان کے تقدس سے کچھ نہیں ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس آیت کو جس میں عیسائی تصور مسیحؑ کے خلاف سختی سے آواز اٹھائی گئی ہے، توڑ مروڑ کر یہی دینیاتی تصورات میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال پیغمبر اسلامؐ سے ایسے عقیدے کو منسوب کرنا جو اُن کے ماننے والوں کے لیے بالکل اجنبیت رکھتا ہے سائنسی تحقیق کے مطالبات کے بالکل منافی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود پروفیسر پارٹ یعنی اس کتاب کے فاضل مرتب رسول اللہؐ کی سیرت کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اون کے مقالہ کی بحث اس سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن کی روشنی میں کس طرح نمودار ہوتی ہے اور ہم رسول اللہؐ کی زندگی کے متعلق قرآن سے کیا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ پارٹ کے کہنے کے مطابق سب سے پہلے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

رسول اللہؐ نہایت ہی حساس مذہبی آدمی تھے کیونکہ انھوں نے اپنی تمام فتوحات کا اپنے آپ کو ذمہ دار
قرار نہیں دیا۔ بلکہ انکسار محض سے ان کو تائید الٰہی سے منسوب کیا۔ یہاں تک کہ مکہ کی فتح بھی جسے
"فتح" کہا گیا ہے، فتح کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب "فیصلہ" ہے۔ دوسرے الفاظ
میں اس کامیابی کا سہرا رسول اللہؐ اپنے یا اپنی جماعت کے سر نہیں لیتے بلکہ خدا کی عظمت اور
قدرت کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ایک پیغمبر تو پیغمبر ہر مسلمان آج بھی جب وہ کچھ کامیابی حاصل
کرتا ہے اور اس کی توقعات پوری ہوتی ہیں خواہ اس کی سطح کچھ بھی کیوں نہ ہو، مادی یا روحانی،
خدا کا شکر "الحمد للہ" کے ساتھ بجا لاتا ہے۔ اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے فضل الٰہی میں اپنی
کامیابی ڈھونڈتا ہے۔ یہاں انکساری کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس چیز کو وہ حقیقت جانتا ہے۔
اور یہی اس کا ایمان ہے۔ اس کی انکساری اس کے ایمان ہی کا ایک جزو ہے۔ رسول اللہؐ کے ضمن میں
انکساری کا بیان مذہبی اقدار کے شعور کی طرف سے بے حسی کی علامت ہے۔

پلمنٹ اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جو طریقۂ کار اختیار کرتا ہے، اس میں وہ تاریخی طریقۂ کار
کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تعبیر بھی شامل کرتا ہے۔ وہ ان واقعات میں جو قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے
متعلق بیان کئے گئے ہیں، رسول اللہؐ کے تجربہ کا عکس دیکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ابتدائی
تاریخ میں صورتِ حاضرہ کو پاتا ہے۔ یعنی اگر قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق سوسائٹی کے اونچے
طبقے (ملاء) کی مخاصمت کا ذکر ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ رسول اللہؐ بھی اس قسم کی
مخاصمت سے دوچار رہے ہوں گے اور اس بات کی تائید ان کے سوانح نگاروں سے ہوتی ہے،
اس سے ہمارا فاضل مصنف ایک بہت دلچسپ انکشاف کا سہرا اپنے سر لیتا ہے۔ یعنی جہاں
حضرت شعیبؑ کی مخالفت ہوئی تو مخالفوں نے کہا: "شعیب ہم کچھ نہیں سمجھتے جو تم کہہ رہے ہو،
تمہارا تعلق ہم میں کے کمزور لوگوں سے ہے۔ اگر ہم کو تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم پر پتھر

پھینکتے کیونکہ تم ہمارے مقابلہ میں طاقتور نہیں ہو۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا
تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَآ اَنْتَ
عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ۔ (۱۱-۹۱)

اب پروفیسر پارٹ کے خیال میں یہاں پتھر پھینکنے سے مطلب سنگساری نہیں ہے جیسا کہ
انجیل کے قصوں میں وارد ہوا ہے بلکہ دھمکی ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہوگی کہ اگر
وہ اپنی دعوت کو یونہی چلاتے رہے تو ان پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ یہ واقعہ کہ کوئی دھمکی انھیں دی
گئی ہوگی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں معلوم ہوتا سوائے ان قصوں کے جو دوسرے پیغمبروں کے
متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ ہم کو پروفیسر پارٹ کی خیال آرائی سے کچھ بحث نہیں بلکہ یہ بتانا
مقصود ہے کہ یہ پتھر رسول اللہؐ کی ذات پر آج بھی پھینکے جاتے ہیں۔ لیکن وہ عرب کے قدیم
صحرا کے گلی کوچوں سے نہیں بلکہ بیسویں صدی کے یورپ کی دانشگاہوں کے مستند مراکز سے،
اور رسول اللہؐ کی مذہبیت پارٹ کی دلچسپی کا اصل موضوع نہیں جتنا یہ بتانا کہ وہ ایک
آدمی تھے۔ اور ان میں وہ تمام کمزوریاں موجود تھیں جو ایک آدمی میں ہوتی ہیں۔ پیغمبر بھی ایسے
واقعات سے دوچار ہوئے کہ ان پر ناکامی و محرومی کا غلبہ ہوا۔ حزن و ملال بھی ان پر چھا گیا۔
لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی غیر یقینی حالت نے ان کو اپنے راستے سے برگشتہ کیا۔ انھوں نے
کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ ہم جیسے انسان ہونے کے باوجود بھی ہم سے الگ تھے۔
ایسے انسان جن کی مثال کی تکرار نہیں ہو سکتی اور اس سے زیادہ گہرے معنوں میں جس معنی میں کسی
فرد کی بھی تکرار نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے سارے فضل و ناموری کے باوجود کسی فرد میں وہ سپردگی اور
محبت پیدا نہیں کر سکتے جو انھوں نے نہ صرف اپنے معاصرین میں پیدا کی، بلکہ آج بھی بے شمار
لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت ایسی ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی ان کے لئے وہ جان کی

بازی لگانے کے لئے تیار ہیں۔ اور انھوں نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ جس کو نہ کسی تلوار اور نہ کسی قلم کا مٹا سکتا ہے۔ اور جس کے نام کے طنین ہر دور میں والہانہ شاعری اور وجد آفرین تصوف کے بہترین نمونے دیکھنے میں آئے۔

لیکن پارٹ کی مرتب کی ہوئی اسی کتاب میں ایک مضمون فوک کا بھی ہے جس نے بڑی سختی سے ان تمام کوششوں کی مذمت کی ہے۔ جو رسول اللہ صلعم کے کردار اور شخصیت کو مسخ کرنے کے سلسلے میں کی جاتی ہیں۔ اس مغربی فاضل کے کہنے کے مطابق مستشرقین جزئیات میں اس طرح پھنس گئے ہیں اور قرآن و اسلام کی خصوصیت کا سراغ تاریخ میں تلاش کرنے میں اس قدر سرگرداں ہو گئے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی تخلیقی شخصیت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں" کبھی بھی عقلی علوم کے ذریعے اس شخصیت کے اسرار کو بے نقاب کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ اور کبھی بھی ہم اپنی جانچ اور تحقیق کے ذریعہ یہ پتہ چلانے کے قابل نہ ہو سکیں گے کہ وہ کیا واردات تھے۔ جنھوں نے ان کی روح کو متاثر کیا یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی صبر آزمائشوں سے گزر کر اپنے کو خدا کی طرف سے منتخب کردہ ایک نذیر اور رسول قرار دیا۔" اس کے مطابق اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو یہ سوال کہ رسول اللہ صلعم کے پیش نظر کیا نمونے اور تاریخ کے کون سے ماخذ تھے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا، غیر اہم سوال بن جاتا ہے۔ یعنی وہ سوالات جو تاریخ کے میکانکی تصورات کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے کہ "عیسائی مناظر اس بات پر مصر رہے ہیں کہ مدینہ کا زمانہ باطنی انحطاط کا زمانہ تھا، اور مدینہ میں وہ ابتدائی ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس قسم کا تصور یہ حقیقت نظر انداز کر دیتا ہے کہ سچا مذہب پورے انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ اور اس کی تمام قوتوں کو متحرک کرتا ہے۔ یہ سوال کہ کیا رسول اللہ صلعم نے مکہ میں بھی سیاسی عمل میں کچھ حصہ لیا ہے۔ لایعنی ہے۔ کیونکہ اُن کے لیے

مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ مدینہ میں ان کو وہ سازگار ماحول ملا جہاں وہ اپنی مکہ کی دعوت کو عملی شکل دے سکے اور جو بھی تصویر ہم رسول اللہ علیہ کی کھینچیں وہ نامکمل رہے گی۔ اگر ہم ان کی شخصیت کے جادو کو نظر انداز کر دیں۔ یہ ان کی شخصیت ہی کی قوت تھی کہ انھوں نے (حضرت) ابوبکر رضؓ اور (حضرت) عمر رضؓ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان کو اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے۔ قرآن حکیم تو تفسیروں اور تشریحوں کے ذریعہ سے اُمت کے سامنے پیش ہوا ہے۔ اور تعبیر و توجیہ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن یہ رسول اللہ صلعم کا ہی اُسوہ ہے جو راہبر اور راہنما کی حیثیت سے ان کے نام لیواؤں کے سامنے آیا ہے۔ جب کبھی بھی اجنبی اثرات کا غلبہ مسلمانوں کے لیے ایک خطرہ بنا تو سنت کی تجدید ان کا نعرہ بنی اور اب بھی مسلمانوں کے تقوی اور زہد میں ہم اُس تجربۂ الٰہی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جس نے تیرہ سو (چودہ سو برس) برس پہلے عرب کے دور دراز صحرا میں محمد بن عبد اللہ کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کے سامنے آئے اور خدا اور اس کے فیصلہ کا پیام دنیا کو سنائے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے۔ جس کے تمام افراد پر ہم یکسانیت کے ساتھ کوئی حکم لگا سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مغرب کے عالموں کو بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ کسی دین پر مذہبی شعور سے بیگانہ ہو کر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

مقالات شبلی جلد ششم

یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں پر جو الزامات عائد کئے ہیں، ان میں ایک بہت بڑا الزام اسکندریہ مصر کے عظیم الشان تاریخی کتب خانے کے جلائے جانے کا بھی ہے، اس جلد میں اون کے رد میں مختلف الزامات پر جان اور بہت سے محققانہ مضامین ہیں، ایک مضمون کتب خانہ اسکندریہ پر بھی ہے، جس میں مستند تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں کے مصر میں داخل ہونے سے صدیوں پہلے خود عیسائیوں کے ہاتھوں جل کر برباد ہو گیا تھا۔

قیمت :- ۱۰ — ۰۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور

شعروسخن کی قدردانی

از عبیداللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۳)

رسول اللہؐ کے موزوں کلمات

۱۔ غزوۂ خندق کے موقع پر مدینہ طیبہ کے اردگرد صحابہ کرامؓ خندق کھودتے اور مٹی پھینکتے ہوئے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدًا ۔۔۔ علی الجہاد ما بقینا ابدًا

ترجمہ: ہم وہ ہیں جنہوں نے زندگی بھر کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کا عہد و پیمان کیا ہے۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

اللّٰھم انہ لا خیر الا خیر الاخرۃ ۔۔۔ فبارک فی الانصار والمہاجرۃ[۱]

"اے اللہ بھلائی تو بس آخرت کی بھلائی ہے، پس انصار اور مہاجرین کی نیت عمل میں برکت عطا فرما۔"

علامہ شبلی نعمانیؒ نے بخاری (کتاب الجہاد، باب حفر الخندق) کی اس روایت کے ضمن میں لکھا ہے، کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موزوں کلام ہے،[۲]

یہ روایت تھوڑے سے فرق کے ساتھ بخاری میں ایک اور جگہ بھی مروی ہے، جس میں اس کی صراحت بھی ہے کہ اس شعر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابۂ کرام بھی دہراتے جاتے تھے،

ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ یہ رجز ہے، جو شعر کی ایک قسم ہے، اسکی روایت ابوداؤد اور بخاری کے ابواب المساجد میں

---

[۱] فتح الباری۔ المغازی ج ۷، ص ۳۹۳، البدایۃ والنہایۃ ج ۴ ص ۹۵، [۲] سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۴۲۲،

کی گئی ہے[۱]، یہ دراصل عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا شعر ہے جسے معمولی تصرف کیساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمایا، اور آپ کبھی کبھی موزوں اور کبھی غیر موزوں پڑھتے تھے، مگر غیر موزوں کو بھی زحاف کے قاعدہ کی رو سے موزوں قرار دیا جاسکتا ہے،[۲]

۲۔ بنو ہوازن بڑے جنگجو اور تیر انداز تھے، انکے مقابلہ میں مسلمانوں کو سخت جنگ کرنی پڑی، ابتداء میں انہیں شکست ہوگئی، تو مسلمان مطمئن ہوکر ادھر ادھر منتشر ہوگئے، اس سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے نہایت سخت حملہ کیا، جس میں تیروں کا مینھ برسنے لگا، اس معرکہ میں وہ رسول اللہؐ کی جانب بھی بڑھے، ابوسفیانؓ آپ کی سواری کی لگام تھامے ہوئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوش اور جذبہ میں بلند آہنگی کے ساتھ بار بار یہ فرماتے جاتے تھے:

انا النبی لا کذب ۔۔۔ انا ابن عبد المطلب

"میں نبی ہوں، اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں، اور عبدالمطلب کا میں فرزند ہوں۔"

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ایسے مبارک کلمات بھی ملتے ہیں، جن سے ایک موزوں مصرع بن جاتا ہے، مثلاً

(الف) أطعموا الأذناب مما تأکلون ۔۔۔ زیر کفالت لوگوں کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔[۳]

مولانا رومؒ نے اس پر دوسرا مصرع لگایا ہے:

مصطفیٰ کرد ایں وصیت با بنون ۔۔۔ أطعموا الأذناب مما تأکلون

(ب) ان تمارضتم لدینا تمرضوا ۔۔۔ اگر ہمارے دین کے معاملہ میں بیمار بنوگے تو بیماری ہوجاؤگے۔

مولانا رومؒ نے اس پر اپنا مصرع اس طرح لگایا ہے:

قول پیغمبر قبولہ یفرض ۔۔۔ ان تمارضتم لدینا تمرضوا

(ج) اشتدی ازمۃ تنفرجی[۴]

یہ مصرع بحر متدارک میں ہے۔ ابن النحوی (م ۵۱۳ھ / ۱۱۱۹ء) مسجد اقصیٰ کے بڑے عالم اور مشہور شاعر تھے، انھوں نے کلام نبویؐ پر تضمین کی ہے، اور پینتیس[۳۵] اشعار پر مشتمل اپنا مشہور قصیدہ "منفرجہ" لکھا ہے، پہلا شعر یوں ہے:

---

[۱] فتح الباری ج ۸ ص ۳۰، [۲] ایضاً ج ۶ ص ۳۰۳، [۳] ایضاً ج ۱۱ ص ۱۹۶، [۴] مسند الشہاب القضاعی، الجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۳۵،

اشتدی ازمۃ تنفرجی   قد آذن لیلک بالبلج [1]

(د) مولانا رومؒ نے کلام نبویؐ میں کہیں کہیں ایک لفظ کے اضافہ سے مصرع موزوں کر دیا ہے، مثلاً:

قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)

خوئے دارم در نماز آن التفات   معنیٔ قرۃ عینی فی الصلوٰۃ

(ہ) کلمینی یا حمیرا (مجھ سے ہم کلام ہو اے حمیرا) مولانا رومؒ کہتے ہیں:

مصطفےٰ آمد کہ سازد ہمدمے   کلمینی یا حمیرا کلمی

(و) نحن الآخرون السابقون (ہم سب سے آخر بھی ہیں، اور سب سے اول بھی) مولانا رومؒ کہتے ہیں:

بہر این فرمود است آں ذوفنون   رمز نحن الآخرون السابقون

(ز) لیس للماضین ھم الموت وانما ھم حسرۃ الفوت (جو لوگ چلے جاتے ہیں انہیں مرنے کا غم نہیں بلکہ (فرصت عمر کے) گذر جانے کی حسرت ہوتی ہے) اس کو مولانا رومؒ اس شعر میں ادا کرتے ہیں:

لیس للماضین ھم الموت گفت   لیک شان با حسرت فوت اند نخفت

مذکورۂ بالا مثالیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ادبی ذوق کا نمونہ ہیں، جو آپ کو اور خصائص کیساتھ بدرگاہ الٰہی سے فرائض نبوت کی انجام دہی کیلئے عطا ہوا تھا۔ صحابہ کرامؓ بھی کلام نبوت کی تاثیر، بلندی اور عظمت دیکھکر حیرت زدہ ہوتے تھے، ایکمرتبہ ایک عربی نے کہا بھی کہ

یا رسول اللہ! ما أفصحک   اے اللہ کے رسولؐ! آپ کی فصاحت کس

ما رأینا الذی ھو اعرب   قدر بلند ہے، ہم نے آپ سے بڑھ کر

منک [2]   عربیت میں باکمال کسی کو نہ پایا۔

آپؐ نے فرمایا: ایسا کیوں نہ ہو جبکہ مجھ پر قرآن فصیح عربی میں نازل کیا گیا ہے، ایکمرتبہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے عرض کیا

یا رسول اللہ! مالک أفصحنا   اے اللہ کے رسولؐ! کیا وجہ ہے کہ آپ ہم

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۳ ، [2] البیہقی فی شعب الایمان، المزہر ج ۱ ص ۱۹ ،

ولم تخرج من بین اظہرنا [1]   میں سب سے بڑھکر فصیح ہیں، حالانکہ آپ

ہمارے ہی درمیان رہے، اور کہیں باہر

استفادہ کیلئے تشریف نہیں لے گئے۔

ارشاد ہوا "زبان اسمٰعیل مٹ چکی تھی جبریلؑ نے آکر اس کی مجھے تلقین کی" اس کا مطلب یہ ہے کہ رب العلمین کی طرف سے نبی کے لئے زبان و بیان کی تعلیم اور ذوق ادب کی تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

شعری یادداشت

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کسی شعر کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر ہوتا تو آپ اس کا مفہوم واضح کرتے، اور کبھی کسی خاص مناسبت سے، آپ کا ذہن مبارک کسی شعر کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ذیل میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

مدینہ طیبہ میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کے آثار پیدا ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی پریشانی اور درخواست پر دعا فرمائی، اور اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا، لوگ پھر پریشان ہو کر آئے، آپؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا، اور فرمایا:

اللّٰھم حوالینا ولا علینا   اے اللہ: ہمارے اردگرد بارش فرما، نہ ہم پر

چنانچہ بادل چھٹ گئے، آپؐ نے فرمایا: ابو طالب آج ہوتے تو انہیں خوشی ہوتی۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ اس شعر کی جانب ہے؟

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ   ثمال الیتامیٰ عصمۃ للارامل

"وہ روشن اور تابناک چہرے والے ہیں، جن کے صدقے میں بادلوں سے پانی مانگا جاتا ہے، وہ یتیموں کی پناہ اور بیواؤں کے والی ہیں؟"

فرمایا: ہاں! [2]

[1] ابن عساکر فی تاریخہ - المزہر ج ۱ ص ۱۹ ، [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۱ ،

یہ شعر ابوطالب نے دورِ نبوت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا تھا جس کی طرف آپ کا ذہن مبارک منتقل ہوا۔

سامہ بن لوی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کیا وہی ابن لوی ہیں جو شاعر ہیں، کسی صحابی نے کہا کیا آنحضور کا اشارہ ان کے اس قول کی طرف ہے:

رب کأس هرقت یا ابن لوی　　حذر الموت لم تکن مهراقه

"کتنے ہی جام، اے ابن لوی! تم نے موت کے اندیشہ سے لنڈھا دیئے، حالانکہ تم ان کو لنڈھانے والے نہ تھے"۔

ارشاد فرمایا: ہاں اسی جانب اشارہ تھا۔[1]

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں ایک گلی سے گزرے، صدیق اکبرؓ بھی ساتھ تھے، کوئی آدمی یہ شعر پڑھ رہا تھا:

یا ایها الرجل المحول رحله　　هلا نزلت بآل عبد الدار

"اے کوچ کرنے والے، تو خاندان عبدالدار میں کیوں نہ مقیم ہو گیا"۔

فرمایا ابوبکر! کیا شاعر نے اسی طرح کہا ہے، انھوں نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسولؐ شاعر نے تو یوں کہا ہے:

یا ایها الرجل المحول رحله　　هلا سألت عن آل عبد مناف

"اے کوچ کرنے والے، تو نے خاندان عبد مناف کا پتہ کیوں نہ دریافت کر لیا"۔

فرمایا: هکذا کنا نسمعه (ہم بھی ایسا ہی سنا کرتے تھے)[2]

امام جلال الدین سیوطی نے یہی روایت ابو علی اسمٰعیل بن قاسم البغدادی القالی (صاحب الامالی) سے نقل کی ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے نے دو شعر پڑھے، اور حضرت صدیق اکبرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استعجاب پر مذکورہ شعر کی تصحیح کرتے ہوئے مزید تین شعر اور سنائے، یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے باب بنو شیبہ میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار سن کر تبسم فرمایا، اور ارشاد ہوا:

هکذا سمعت الرواة ینشدونه　　میں نے لوگوں کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔[3]

غزوۂ بدر میں مسلمانوں اور فریق مخالف میں ایک اور تین کا تناسب تھا، مسلمانوں کے پاس

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۶۳، [2] دلائل الاعجاز ص ۱۰، [3] المزہر ج ۲ ص ۱۴۔

ہتھیاروں اور سامان رسد کی بھی قلت تھی، مگر غیبی نصرت نے اہل ایمان کو فتح یاب کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کی نعشیں ادھر ادھر پڑی دیکھیں، تو صدیق اکبرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ابوطالب کے زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہماری تلواریں ایک ایک جوڑ پر لگی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ابوطالب کے اس شعر کی طرف تھا:

کذبتم وبیت اللہ ان جد ما أری　　لتلتبسن اسیافنا بالانامل[1]

"تم لوگوں نے غلط کہا، میں تو بیت اللہ کی قسم۔ زیادہ تر یہی دیکھتا ہوں کہ ہماری تلواریں انگلیوں کے ایک ایک پور پر لگتی ہیں۔"

ام المومنین حضرت سودہؓ نے ایک بار یہ مصرع پڑھا:

عدی وتیم تبتغی من تحالف　　عدی و تیم کو تمہارے دوست کی جستجو ہے۔

اس کے علاوہ کچھ مزید اشعار بھی تھے، جب حضرت سودہؓ کی زبان سے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے سنا تو ان کو خیال ہوا کہ سودہؓ نے ان پر تعریض کی ہے، بحث ہونے لگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا، تو وہاں تشریف لے گئے، اور فرمایا: افسوس! قریش کے عدی و تیم سے اس مصرع کا تعلق نہیں ہے، بلکہ اس میں قبیلہ تمیم کی دو شاخوں، عدی اور تیم کا ذکر ہے، نہ کہ تمہارا۔[2]

آپؐ کبھی کبھی اصلاح بھی فرماتے تھے	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبان و ادب میں قواعد کی غلطیوں اور لب و لہجہ کی ناہمواری کو پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ

ایک شخص نے غلط زبان استعمال کی تو فرمایا:

ارشدوا اخاکم فقد ضل[3]　　اپنے بھائی کی رہنمائی کرو، اس لئے کہ وہ بھٹک گیا ہے۔

---

[1] دلائل الاعجاز ص ۱۵، [2] ایضاً ص ۱۷، [3] المزہر ج ۲ ص ۱۹۹،

دورِ جاہلیت کے ایک شاعر زید الخیل، قبیلہ طی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کلمۂ توحید پڑھ کر مسلمان ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر زید الخیر تجویز فرمایا، پھر ارشاد ہوا کہ دورِ جاہلیت میں جس کسی آدمی کے اوصاف میرے سامنے بیان کئے گئے، اسلام لانے کے بعد میں نے اسے ان اوصاف سے فروتر پایا، مگر تم اس بارے میں مستثنیٰ ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔[1]

کئی موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منظوم کلام کی اصلاح بھی فرمائی، چنانچہ غزوۂ احد میں ہبیرہ بن ابی وہب (ایک مشرک) کے جواب میں کعب رضی اللہ عنہ بن مالک نے چند اشعار پڑھے، ان میں ایک شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی تھا، جو یہ ہے:

مجالدنا عن جذمنا کل فخمۃ　　　مذربۃ فیہا القوانس تلمع

"ہماری اساس و افتخار کی مدافعت میں ہر ایسی عظمت سے معرکہ آرا ہو جاتے ہیں، جن کے تاج چمکتے رہتے ہیں۔"

فرمایا، عن جذمنا کے بجائے عن دیننا کہو (یعنی ہمارے دین کی طرف سے مدافعت میں) کعب رضی اللہ عنہ بن مالک کو یہ اصلاح پسند آئی، اور انھوں نے اپنے شعر میں ترمیم کرلی۔[2]

کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" پڑھا جو ادبی محاسن سے پُر تھا، اور یہ شعر تو بیت الغزل تھا:

ان الرسول لنور یستضاء بہ　　　وصارم من سیوف الہند مسلول

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصیدہ سنکر اپنا پیراہن مبارک کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر کو عنایت فرمایا، مگر مذکورہ شعر میں "من سیوف الہند" کی جگہ "من سیوف اللہ" کی اصلاح فرمادی۔ جس سے شعر کی معنویت دوچند ہوگئی، ترجمہ یہ ہے:

---

[1] الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص ۱۵۷ ۔ [2] المزہر ج ۲ ص ۱۹۹

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نور ہیں جن سے کسب نور کیا جاتا ہے، اور اللہ کی ایک بے نیام تلوار ہیں"

کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر پہلے باغیانہ خیالات رکھتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف تھے، جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو ایک روز صبح اندھیرے میں مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ایک انصاری صحابی نے پہچان لیا، اور ان کے قریب آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، کہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس دشمن خدا کی گردن اڑا دوں، مگر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے رہنے دو، یہ پچھلے خیالات ترک کر چکے ہیں، اور تائب ہو کر حاضر ہو رہے ہیں، کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر کو ان انصاری کی بات گراں گزری، اور انھوں نے اپنے قصیدہ میں انصار کی مذمت سے متعلق بھی چند اشعار بڑھا دیئے، لیکن فرد واحد سے شکایت و تکلیف کی بنا پر پورے قبیلہ کو مطعون کرنا مناسب نہ تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "انصار کا بھی ذکر خیر کرنا تھا، وہ اس کے مستحق بھی ہیں" چنانچہ کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر نے انصار کی مدح میں بھی کچھ اشعار کہے، اور انہیں اپنے قصیدہ میں شامل کرلیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کی تعریف سنی، تو بلا کر ان سے فرمایا، تم جب شعر کہنا چاہتے ہو تو کس طرح کہتے ہو؟ وہ کہنے لگے میں فکر سخن میں لگ جاتا ہوں پھر شعر کہتا ہوں۔ فرمایا: مشرکین کو اپنا موضوع بناؤ، یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ تھا، کہ شعر و ادب سے بھی تخریب پسندوں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پہلے سے تو اس جانب میری کوئی توجہ نہیں تھی، البتہ میں نے برجستہ یہ شعر کہا:

فخبرونی اثمان العباء متیٰ　　　کنتم مطاریق او دانت لکم مضر

"اے قریش! تمہاری قدر و قیمت چوغہ و عبا جیسی ہے، مجھے بتاؤ کہ تم کب آتش و آہن کے مرد تھے، یا مضر کب تمہارے سامنے زیر ہوئے"

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۱

قریش تمام قبائل عرب میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، عبداللہ بن رواحہ کا بیان ہے کہ ان کے بارے میں "اثمان العباء" کے الفاظ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر میں نے ناپسندیدگی کے آثار دیکھے، جس سے مجھے احساس ہوا، کہ چاہے حریف اور دشمن ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو، مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہئے چنانچہ میں نے فوراً ہی حقیقت بیانی سے کام لیا، اور دوسرے اشعار کہے آخری شعر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعا دی اور فرمایا: خدا تم کو (حق اور صداقت پر) ثابت قدم رکھے،[۱] جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ اَلَمْ — اور شعرا کا بیہودہ لوگ اتباع کرتے ہیں،

تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَ — کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر وادی میں

اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ — سرگرداں رہتے ہیں، اور کہتے ہیں

(شعراء:) — جو کرتے نہیں ہیں۔

تو حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ کو یہ آیت سن کر بڑا غم ہوا، غمناک حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، کہ خدا نے یہ آیت نازل کی ہے، اور وہ جانتا ہے کہ ہم شاعر ہیں، فرمایا: اس آیت کا بقیہ حصہ پڑھو۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — مگر وہ لوگ جو ایمان لائیں اور حسن

(شعراء:) — عمل کا شیوہ اختیار کریں۔

اس سے تمہارے ہی جیسے شعراء مراد ہیں۔ اور اس کے بعد ہے:

وَانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (شعراء:) اور جب ان پر زیادتی ہو تب بدلہ لیتے ہیں

اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۱] طبرانی کبیر، جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸۔

انصروا ولا تقولوا الا حقا — (اسلام اور مسلمانوں کی) حمایت و مدافعت کرو،

ولا تذکروا الآباء والامہات[۱] — اور درست بات کہو، لیکن انکے ماں باپ کا ذکر نہ کرو۔

شرپسند عناصر کا جواب دینے کے لئے ان کی معنوی کمزوریوں، نقائص اور فکری بے مائگی سے واقفیت ضروری ہے، اس کے بغیر نہ تو اپنے نقطۂ نظر کی برتری ثابت کی جاسکتی ہے، اور نہ کلام میں زور و اثر پیدا ہوسکتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کو اس کی جانب بھی توجہ دلائی اور فرمایا:

اہجہم وائت الی ابی بکر — ان کی ہجو کرو، جاؤ ابوبکر سے ملو، وہ تم

یخبرک بمعائب القوم[۲] — کو ان لوگوں کے کمزور پہلو سمجھا دیں گے

اس تفصیل سے شعروسخن کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، کہ وہ پاکیزہ خیالات اور صحیح افکار پر مشتمل اشعار کو ناپسند نہیں کرتا، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کو مسجد میں بھی ادب و وقار کے ساتھ شعر سنانے کی اجازت دی تھی۔[۳] اور اگر شعروشاعری کا مقصد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و دفاع ہو تو وہ داخل عبادت ہوگی۔[۴]

مذموم شاعری دور جاہلیت کی شاعری میں فحش نگاری، بیجا قومی عصبیت، نسلی فخر و غرور اور کردہ کشی وغیرہ عام تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خاتمہ کرکے عفت، پاکیزگی اور حق و صداقت کی دعوت دی، اور شعروسخن میں بھی پاکیزہ اور حق و صداقت پر مبنی خیالات موزوں کرنے کی تلقین فرمائی، ذیل میں ان کی کسی قدر وضاحت کی جاتی ہے۔

قریش دوسرے قبائل کو اپنے سے فروتر تصور کرتے تھے، اوپر گذر چکا ہے، کہ انھوں نے جب مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی تو ان کی خواہش تھی کہ حضرت علی مرتضیٰ مسلمانوں کی طرف سے ان کا جواب دیں، کیونکہ ان کا تعلق قریش سے تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کو جواب دینے

---

[۱] طبرانی ج ۲ ص ۱۵۳، [۲] ابن عساکر ج ۴ ص ۱۳۵، [۳] بخاری، ابوداؤد، والترمذی، جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷، [۴] فیض الباری ج ۲ ص ۵۴، ۲۷۰

کے لئے مامور فرما کر ان کی نخوت، غرور اور قومی عصبیت پر ضرب لگائی۔

حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ عرج کی وادی میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک ایک شاعر اپنے اشعار پڑھنے لگا، آپؐ نے فرمایا:

خذوا الشیطان او امسکوا الشیطان　　اس شیطان کو پکڑو (یا فرمایا) روکو، تمہارا
لان یمتلی جوف احدکم قیحا خیر له　　اندرون گندے خون سے بھر جائے، یہ
من ان یمتلی شعرا[1]　　اس بات سے بہتر ہوگا کہ ایسے اشعار سے بھر جائے۔

امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے کہ اس کے اشعار فحش تھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار میں ذاتِ رسالت پر رکیک حملے بھی کئے گئے تھے[2]۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن اشعار میں کسی کی آبرو ریزی کی گئی ہو، یا فحش باتیں کہی گئی ہوں، اور وہ اخلاق و شرافت سے فروتر ہوں، وہ بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں مقبول نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا اس طرح کے اشعار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پڑھے جاتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس قسم کے اشعار کو آپ قابلِ نفرت خیال کرتے تھے[3]۔ گویا اس طرح کی شاعری وقت کی بربادی اور نیکیوں کے ضیاع کا سبب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قرض بیت شعر بعد العشاء　　جو شاعر عشاء کی نماز کے بعد (فحش اور
الآخرۃ لم تقبل له صلوٰۃ تلک اللیلۃ[4]　　بیہودہ) اشعار کہے، اس شب میں اسکی
نماز بھی قبول نہیں۔

نیز آپؐ نے ایسے شاعر کو عقل و دانش سے عاری اور پاگل قرار دیا، اور اس کی صورت دیکھنا

---

[1] جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۶ [2] روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۵۱، [3] مسند احمد۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸ [4] مسند احمد والبزار والطبرانی الکبیر جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۵۔

بھی آپؐ پسند نہ فرماتے تھے[1]۔ آپ کو مسلمانوں کے خلاف اشعار سن لینا گوارا تھا۔ چنانچہ بدر و احد کی جنگوں میں قریش کے شاعروں نے جو اشعار کہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نقل و روایت کرنے کی لوگوں کو اجازت دی تھی، باوجودیکہ ان میں آپ سے اور اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اور نفرت کا اظہار کیا گیا تھا، مگر آپؐ نے امیہ بن ابی الصلت کے قصیدہ حائیہ کی روایت سے منع فرمایا۔ اس لئے کہ وہ فحش اشعار پر مشتمل تھا[2]، ایک جاہلی شاعر اعشیٰ نے علقمہ (ایک غیر مسلم) کی ہجو کہی تو اس کی نقل و روایت سے بھی منع کیا، تاکہ کردار کشی کی غلط روایت نہ قائم ہو، حالانکہ اس بارہ میں حضرت حسانؓ نے یہ کہا بھی کہ اے اللہ کے رسولؐ! ایک مشرک کی جو قیصر کے دربار میں ہے، ہجو کی روایت کرنے سے آپؐ کیوں منع فرماتے ہیں؟[3] مگر آپؐ نے ان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا، اور علقمہ کی شرافت اور اچھے کردار کی وجہ سے اس کی ہجو کو ناپسند فرمایا، ہجویہ اشعار اگر شرافت اور اخلاق کے دائرہ میں ہوں، تو اسلام انکی نقل و روایت پر کوئی پابندی نہیں لگاتا، لیکن اگر وہ اخلاق و انسانیت کے خلاف یا ان کی تباہی کا موجب ہوں تو ان پر بندش کی جائے گی۔ آپؐ نے فرمایا:

من قال فی الاسلام هجاء مقذعا　　جس نے اسلام میں فحش ہجو کہی، اس کی
فلسانه هدر[4]　　زبان ناکارہ ہے۔

جنگ کا موقع ہو تو ہجو گوئی کرنے اور فحش اشعار کہنے والا بھی دشمن اور حریف تصور کیا جائے گا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ میدان جنگ میں دشمنوں کو ترغیب دینے کے جرم کا مرتکب ہو، چنانچہ اس طرح کا ایک شخص ابو عفک پکڑا گیا، تو آپؐ نے فرمایا:

من لی بهذا الخبیث　　کوئی ہے جو اس خبیث کی خبر لے،

چنانچہ سالم بن عمیرؓ آگے بڑھے اور اس کا کام تمام کر دیا[5]۔

---

[1] الدیلمی فی مسند الفردوس [2] روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۵۱ [3] مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۲۲ اور دلائل الاعجاز ص ۱۶ [4] العمدہ ج ۲ ص ۱۳۹ [5] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۳۶،

بیہودہ گوئی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام ہدایات بھی فرمائی ہیں، ارشاد ہے کہ آدمی کے زیادہ تر گناہ اسکی زبان سے تعلق رکھتے ہیں[1]، ایک مرتبہ فرمایا کہ ہر ایسے کام سے بچو جس کے لئے تمھیں معذرت کرنی پڑے[2]، یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بے حیا اور بیہودہ گو کو پسند نہیں کرتا، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ بدکلامی ایک نحوست ہے[3]۔ ان ارشادات کو شعر و ادب سے بے تعلق نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

تکلف، چرب زبانی اور لفاظی کی مذمت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تصنع اور بناوٹ کو ناپسند فرماتے تھے[4]، خواہ مخواہ اور بلا ضرورت پر تکلف الفاظ میں فصاحت بیانی کا مظاہرہ کرنیوالوں پر آپ نے سخت نکیر فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ یہ برباد ہوئے (ھلک المتنطعون)، پر تکلف اسلوب، معنوی قدر و قیمت اور کلام کے وقار، وزن اور فائدے کو ختم کر دیتا ہے، دور جاہلیت میں کاہنوں کا بڑا زور تھا اور ان کی نثر کا بڑا شہرہ تھا، حالانکہ وہ معنی و مفہوم سے عاری، مبہم، غامض اور پیچیدہ ہوتی تھی، اس لئے آپ نے اسکی نقالی سے منع فرمایا[5]، شعر و شاعری میں بھی آپ کو سادہ اور فطری اسلوب پسند تھا، چنانچہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو شعر و سخن میں قافیہ بندی اور سجع کے زیادہ پیچھے پڑنے اور آرائش لفظی ہی پر تمام تر توجہ مرکوز کر دینے سے منع فرمایا، ایاک والسجع یا ابن رواحہ۔

بے جا مداحی پر گرفت

شعر و سخن کی ایک صنف قصیدہ نگاری کا بھی عربوں میں بڑا رواج تھا، صالح افراد اور بلند اوصاف کے حامل اشخاص کو روشناس کرانے اور انکے کمالات اور کارناموں کو نمایاں کرنے کیلئے اس صنف کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسمیں صحابہ کرام کو فکر سخن کرنیکی دعوت دی ہے، ایک مرتبہ طلحہ رضی بن عبید اللہ نے بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان رضی بن ثابت کو حکم دیا کہ انکی تعریف میں اشعار کہیں، کعب رضی بن زہیر کو انصار کی مدح میں شعر کہنے کی ترغیب دی، لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ قصیدہ نگاری کو ایک پیشہ بنا لیا جائے، مداحی حصول زر کی خاطر کیجائے یا کسی کے سر پر غرور کو دام تزویر میں لانے اور اسے خوش فہمی میں رکھنے کے لئے، وہ کسی حال میں بھی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی مستحق نہیں ہو سکتی، چنانچہ مداحی، بیجا تعریف اور غرض پر مبنی شاعری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسند تھی، کیونکہ یہ کذب و ریا اور حرص و آز کا وسیلہ بنتی ہے، فرمایا:

[1] یہ روایات جامع صغیر سے ماخوذ ہیں، [2] ایضاً، [3] البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۱۲، [4] ابو یعلی موصلی، جامع صغیر،

احثوا فی وجوہ المداحین التراب[1] — (بے جا) مداحی کرنے والوں پر خاک ڈالو
اذا رأیتم المداحین فاحثوا فی وجوھھم التراب (مسلم، ابوداؤد، الترمذی)۔ — (بے جا) مداحی کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے چہروں پر خاک ڈال دو۔
(جامع صغیر ج ۱ ص ۱۰)

ارشاد بالا میں "المداحین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور عربی قواعد کی رو سے فعل کے بجائے اسم استعمال کرنے میں اس طرف بھی اشارہ مقصود ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قصیدہ خوانی کو اپنی فطرت کا ایک جز بنا لیا ہے۔ اور یہی انکا پیشہ قرار پا گیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ "مداحین" میں مبالغہ کا مفہوم بھی شامل ہے، یعنی بے جا تعریف کرنیوالے لوگ، پھر فرمایا کہ ان کے چہروں پر خاک ڈالدو، اسکا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ تعریف اور خوشامد کرکے تم سے داد و دہش کے طالب ہیں، تم انکے چہروں کی رونق بڑھانے کے بجائے ایسا رویہ اختیار کرو کہ وہ شرم سار ہوں، اور اپنا وطیرہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں، ایک اور موقع پر فرمایا:

ایاکم والتمادح فانہ الذبح — (بے موقع اور بیجا) باہم مدح سرائی سے بچو
(ابن ماجہ۔ جامع صغیر ج ۱ ص ۳۹۶) — اس لئے کہ وہ جان لیوا ہے۔

ایک اور روایت ہے:

ایاکم والمدح فانہ الذم[2] — (بے جا) مدح سرائی سے بچو اس لئے کہ وہ ایک عیب ہے۔

ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ خودداری اور وقار کو ہر حال میں باقی رکھنا چاہئے، گداگری اور سوال و طلب سے علم و فن کی آبرو مجروح ہوتی ہے، اور بیجا مداحی سے شعر و ادب کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ اور اسکا معیار پست ہو جاتا ہے، اور دینی و اجتماعی معاملات میں خاص طور پر پیشہ وارانہ مداحی اور قصیدہ خوانی نہایت تباہ کن ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

دین میں انتہا پسندی سے بچو، اس لئے کہ تم سے پہلے لوگ اسی غلو کی وجہ سے برباد ہوئے ہیں[3]

یہ انتہا پسندی اور غلو جسطرح زندگی کے دیگر شعبوں میں تباہ کن ہے، اسی طرح شعر و ادب میں بھی سخت معیوب ہے۔

[1] مسلم و ابوداؤد، [2] مسند احمد، [3] مسند احمد، نسائی، مستدرک حاکم۔ جامع صغیر ج ۱ ص ۳۹۴

ایک بین الاقوامی سمینار کے سلسلہ میں
لندن کی ڈائری
(۲)

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

ایران کا دعوت نامہ میری تقریر کے بعد ایران کے انٹرنیشنل ریلیشنز ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر میرے پاس آئے، اور اپنا کارڈ دے کر کہنے لگے کہ اگر آپ کے پاس ایران سے دعوت جائے، تو آپ اس کو ضرور قبول کریں، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

امپیکٹ کے اڈیٹر صاحب سے ملاقات سمینار کی مشغولیتیں ختم ہوئیں تو، ۷ اگست کو امپیکٹ کے اڈیٹر جناب ام۔ اچ فاروقی صاحب کے یہاں برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے ساتھ گیا، وہ فورٹ ڈیل روڈ پر رہتے ہیں، وہاں انکے ماموں محمود اعظم فاروقی صاحب بھی مقیم تھے، جو کچھ دنوں جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں، اتفاق سے وہاں اسلامک فونڈیشن لسسٹر کے ڈائرکٹر جناب خرم مراد صاحب بھی آگئے ان کا تعلق بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں کے خاندان سے رہا ہے، امپیکٹ کے اڈیٹر جناب فاروقی صاحب کی ننہال اعظم گڈھ کے گاؤں علی پور میں تھی، اسی تعلق کی بنا پر اعظم گڈھ کا ذکر زیادہ رہا، جناب محمود اعظم فاروقی صاحب، جناب اقبال سہیل مرحوم کا ذکر دیر تک کرتے رہے، اور ان کے کچھ لطیفے بھی سنائے، پاکستان اور ایران کی سیاست کا بھی موضوع بیچ بیچ میں آتا رہا، اس مجلس میں ایران کے اسلامی انقلاب سے متعلق وہ رائے نہیں تھی، جو اور جگہ سننے میں آئی تھی، ام۔ اچ۔ فاروقی صاحب دار المصنفین کے سمینار "اسلام اور مستشرقین" کے متعلق

بھی باتیں دیر تک کرتے رہے، کہنے لگے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کا خط شائع نہ کرنا چاہئے تھا، خواہ مخواہ کی بحث چھڑ گئی، انھوں نے ہندوستانی مذاق کا بہت پر تکلف اور لذیذ کھانا کھلایا، کئی وقت کے بعد ایسا کھانا ملا تو سیر ہو کر کھایا، امپیکٹ پندرہ روزہ اخبار ہے، دنیا کے سیاسی مسائل پر بہت ہی سنجیدہ اور جچی تلی رائے دیتا ہے، مسلمان ممالک کے سیاسی واقعات پر عمدہ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ کرتا ہے، اس کی انگریزی بھی معیاری ہوتی ہے، فاروقی صاحب ہندوستان نژاد ہیں اور اب پاکستانی ہیں، انگریزی انگریز جرنلسٹ ہی کی طرح لکھتے ہیں، معارف کے تبادلہ میں آیا کرتا ہے میں اس کو شوق سے پڑھا کرتا ہوں، برادرم ڈاکٹر سلمان ندوی نے فاروقی صاحب کے گھر آنے جانے میں تقریباً سولہ پونڈ خرچ کیے، یعنی ہندوستانی سکے میں تقریباً دو سو روپے ہوئے، مجھکو یہ گراں گذرا، مگر وہ بولے کہ یہ گرانی محسوس کی جائے تو پھر ملنا ملانا کیسے ہو

برمنگھم کی سیر ۸ اگست کو یو۔ کے۔ اسلامک مشن کے ڈائرکٹر جناب رشید احمد صدیقی برمنگھم کی اپنی شاخیں دکھانے کو لے گئے، قافلہ میں پنجاب کے امیر جماعت اسلامی جناب سید اسعد گیلانی، لاہور کے مولانا عبدالحلیم قاسمی، اور ان کے صاحبزادے، بلوچستان کے جناب امان اللہ، سندھ کے جناب سلیمان طاہر اور حافظ موسیٰ بھٹو تھے، مولانا تقی امینی بھی مدعو تھے مگر اپنی علالت کی وجہ سے نہ جا سکے، برمنگھم لندن سے ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے، راستے میں انگلستان کے ان علاقوں کے دیکھنے کا موقع ملا، سڑک ہر جگہ نہایت عمدہ تھی، جس پر ٹریفک کی تین سفید لکیریں برمنگھم تک چلی گئی تھیں، راستے کے مکانات صاف ستھرے دکھائی دیے، کوئی مکان گرا پڑا یا خستہ نہیں دکھائی دیا، یہاں رہائشی مکانات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، ڈیڑھ دو سو مربع گز سے زیادہ کے نہیں ہوتے، اور تقریباً ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں کھپریل کی چھتیں دونوں طرف ڈھلوان ہوتی ہیں تاکہ برف اور اولے ڈھل کر نیچے گر جائیں، موسم سرما میں یہاں برفباری بہت ہوتی ہے، لندن کے بعد برمنگھم ہی بڑا شہر ہے، جابجا فیکٹریاں دکھائی دیں،

فصل کا زمانہ نہیں تھا، لیکن کھیت صاف ستھرے اور مسطح تھے کہیں کہیں بڑے بڑے درخت اور جھاڑیاں کھیتوں کے کنارے تھیں، بھیڑیں وسیع چراگاہوں میں چر رہی تھیں، برمنگھم پہونچ کر پہلے ہم لوگ ۱۸۰ - انڈرٹن روڈ گئے، جس کمرہ میں ہم لوگ بٹھائے گئے، اس کی ایک الماری میں خطبات سرسید اور مقالات سرسید کی سولہ جلدیں دیکھیں، ان کو اسمٰعیل پانی پتی نے اڈٹ کیا ہے، اور یہ مجلس ترقی ادب اردو لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، وہاں کتابوں کی ایک دوکان دیکھی جس میں زیادہ تر بچوں اور عام لوگوں کے لئے مذہبی کتابیں تھیں، یہاں سے ایک رسالہ "اذان" بھی نکلتا ہے جس میں عام فہم مذہبی مضامین شائع ہوتے ہیں، اس سنٹر میں بچوں اور بچیوں کے لئے مدارس بھی ہیں جو سرکاری اسکولوں کے اوقات کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے یہاں اردو اور مذہبی تعلیم پاتے ہیں، کلام پاک پڑھانے کا خاص اہتمام ہے، یہ بتایا گیا کہ اس وقت ایک سو اکیس لڑکے اور لڑکیاں کلام پاک پڑھنا سیکھتی ہیں، حفظ کلام پاک بھی کرایا جاتا ہے، ایک گیارہ برس کے لڑکے کو دکھایا گیا جس نے حال ہی میں پورا کلام پاک حفظ کیا تھا، بچیاں یہاں ساتر لباس میں اور چادر اوڑھ کر آتی ہیں، ان کی استانیاں تقریباً برقعہ ہی میں دکھائی دیں، اس مدرسہ کے ساتھ ایک کشادہ مسجد بھی ہے جس میں ہم لوگوں نے ظہر کی نماز پڑھی، اس کے بعد ہم لوگوں سے تقریریں کرائی گئیں، میں نے جماعت اسلامی کے ذکر کے سلسلہ میں زیادہ تر مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہندوستان کا ذکر خیر کیا، تو حاضرین ان کے فضائل سے بہت متاثر تھے، کھانا بڑا پر تکلف ملا، جو فرش پر دسترخوان ہی پر بیٹھ کر کھایا گیا، پلاؤ قورمہ کے ساتھ پھلوں کی بڑی فراوانی تھی، اس علاقہ میں دس ہزار مسلمان رہتے ہیں، وہاں سے چل کر ہم لوگ ۳۲۴ اسٹریٹ فورڈ آئے، یہاں پیغام اسلام ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ ہے جس کے ڈائرکٹر سید منور حسین مشہدی صاحب ہیں، یہاں اردو کی کتابوں کی بڑی دوکان بھی ہے جس میں سیرۃ النبی کا سٹ بھی تھا، جو لاہور کے کسی ناشر نے بہت ہی خراب کتابت و طباعت کے ساتھ چھاپا ہے اس کو دیکھ کر تکلیف ہوئی، ڈائرکٹر صاحب سے کہا کہ دار المصنفین یا نیشنل

یا نیشنل بک فونڈیشن اسلام آباد سے منگا کر فروخت کی جائے تو بہتر ہے، دار المصنفین کی کچھ اور مطبوعات بھی تھیں، ہم لوگ ایک کمرہ میں چائے پینے کے لئے جمع ہوئے تو ایک الماری میں کتاب المبسوط لشمس الدین السرخسی کی ۳۰ جلدیں دیکھیں، جو بیروت، لبنان سے عمدہ ٹائپ میں شایع ہوئی ہیں، تفسیر حقانی کی چار جلدیں، تفسیر ابن کثیر کی بھی چار جلدیں اور معارف القرآن کی آٹھ جلدیں بھی وہاں تھیں، وہاں سے تھوڑی دور پر ان ہی لوگوں کا ایک چھاپہ خانہ، اور مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے ایک پرائمری اسکول بھی ہے، جو وہاں کے سرکاری کونسل کی مدد سے چلتا ہے، یہاں میونسپلٹی کو کونسل ہی کہا جاتا ہے، اس اسکول کی بڑی استانی کو تنخواہ میں پچاسی پونڈ فی ہفتہ ملتا ہے، ہندوستانی سکہ سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار روپے ماہانہ ہوتے ہیں، وہاں سے ایک پر تکلف چائے پی کر ہم لوگ وال سال مڈلینڈ آئے، جہاں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ساتھ پڑھ لی گئیں، یہاں بھی ہم لوگوں کو تقریریں کرنی پڑیں، حاضرین نے کچھ سوالات کئے، ایران اور پاکستان کی سیاست پر کچھ اختلاف پیدا ہو کر بد مزگی پیدا ہونے والی تھی کہ جناب رشید احمد صدیقی نے اس کو اچھی طرح نباہا، وہاں ایک نئی مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے، جس کے اخراجات کا تخمینہ پچیس لاکھ پونڈ ہے، اس میں جمعہ کی نماز میں عورتوں کی شرکت کا بھی اہتمام ہوگا، یہاں بھی بچوں اور بچیوں کا ایک پرائمری اسکول ہے، جو رات ہو جانے کی وجہ سے ہم لوگ دیکھ نہ سکے، واپسی میں لسسٹر جانے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن دیر ہو جانے کی وجہ سے وہاں جا نہ سکے، ہم لوگ واپس ہو رہے تھے تو ایک بجے رات کو راستہ میں چائے پینے کے لئے ایک بڑے ریسٹوران میں گئے، جو مسافروں ہی کے لئے تھا، لیکن اتنی رات گئے بھی یہ جوان لڑکوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ تفریح کے لئے آئی ہوئی تھیں، شاید انھوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا آنے والی نہیں ہے، اسی لئے وہ اسی دنیا میں زندگی کے سارے عیش اٹھانے کی قائل ہیں،

ہمارے رفقاء کو موسم بہت خوشگوار معلوم ہوا اس لئے ریسٹوران سے باہر ٹہل کر اس سے لطف لیتے رہے۔ دو بجے رات کو ہم لوگ اپنی قیامگاہ پر واپس آئے، بستر پر لیٹا تو یورپ کے اسلامک مشن کی تنظیموں سے متاثر تھا کہ دیار غیر میں اسلام کی سربلندی کے لئے اس کے ذریعہ سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ضرور سراہنے کے لائق ہے، معلوم ہوا کہ انگلستان میں ان کے ۵۲ ایسے سنٹر ہیں، ایثار پسند اور مخلص لوگ اگر مل جائیں تو پھر ہر قسم کا کام انجام پا سکتا ہے، جماعت اسلامی کو ایسے لوگ اب تک مل رہے ہیں، اس لئے ان کا مشن جاری ہے۔

سیمینار کے ملاقاتی

سیمینار کی تمام تقریبات ۸ راگست تک ختم ہو چکی تھیں، ۱۰ راگست تک مہمان بنے رہنے کی اجازت تھی، مگر نمایندے ۹ راگست ہی سے رخصت ہونے لگے، برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی اسی روز کراچی چلے گئے، میں بھی مہمانوں سے رخصت ہونے میں لگ گیا، ان میں سے بعض کی یادیں دل میں نقش ہیں، مسلم انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ظفر بنگش صاحب برابر خاطرداری میں لگے رہے، جو ضرورت ہوتی، اس کو پوری کرتے رہے، وہ کینڈا سے آئے ہوئے تھے، وہاں کریسنٹ انٹرنیشنل نکالتے ہیں، ڈاکٹر کلیم صدیقی ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لئے سیمینار کی تقریب سنبھالنے کے لئے بلائے گئے تھے، غیاث الدین صاحب بھی اس کے انتظام میں آگے آگے رہے سارے مراسلات ان ہی کی طرف سے ہوتے رہے، ظفر الاسلام اس کے کنوینر تھے، اعظم گڈھ ان کا آبائی وطن ہے، اس لئے اخلاق سے پیش آتے رہے، نسیم خاں صاحب کا تعلق کسی زمانہ میں بہار سے رہا ہے، اب پاکستانی ہیں، مسلم انسٹیٹوٹ ہی میں ہیں، میری ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مستعد رہے، آخر وقت تک ان کی مہربانیوں سے ہر قسم کی سہولتیں رہیں۔

سیمینار میں جن نمایندوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن دوئی بہت ہی اخلاص و محبت سے ملتے رہے، وہ احمد بیلو یونیورسٹی زاریہ نائجیریا میں اسلامک لیگل اسٹڈیز سنٹر کے پروفیسر

اور ڈائرکٹر ہیں، گجرات کے رہنے والے ہیں، لیکن عرصہ سے نائجیریا میں ملازم ہیں، اسلام آباد میں پندرہویں صدی کے سیمینار میں ملاقات ہو چکی تھی، ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شفیق عزیز مل رہا ہے، برابر ساتھ رہے، بڑی میٹھی گفتگو کرتے ہیں، ہر قسم کی چھوٹی بڑی ضرورتیں پوری کرتے رہے، حدیث و قرآن اور فقہ پر چھوٹے چھوٹے رسالے انگریزی میں لکھے ہیں، جو لندن کے ناشروں نے شائع کئے ہیں، کتابوں کی نمائش میں ان کی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں، انھوں نے اپنی ایک کتاب Non-Muslim under shariah پڑھنے کو دی، اس پر ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، میرا ایک مضمون "اسلام میں مذہبی رواداری" کے عنوان سے معارف میں کئی قسطوں میں شائع ہوا ہے، اس کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگے کہ اس کو جلد از جلد چھپوانے کی ضرورت ہے، اور اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہونا چاہئے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری پر میری جو ۲ جلدیں ہیں، ان کو ان کے پاس بھجوانے کا تقاضا اور اصرار کیا،

جناب سید اسعد گیلانی امیر جماعت اسلامی پنجاب کی ذاتی خوبیوں سے بھی متاثر ہوا، وہ تقریباً بئیس کتابوں کے مصنف ہیں، باتیں بڑی جچی تلی کرتے ہیں، ایران کے انقلاب سے متاثر ہیں، برابر کہتے رہے کہ امام خمینی کو مدد پہونچانے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ انقلاب مؤثر اور پائیدار ہو، اپنی تصانیف دار المصنفین بھجوانے کا وعدہ کیا ہے۔

بنگلہ دیش کے پروفیسر انور علی ڈھاکہ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے ہیں، مگر وضع قطع میں مولوی معلوم ہوتے تھے، انگریزی اور اردو دونوں خالص بنگالی لب و لہجہ میں بولتے، جب کبھی انھوں نے مجھکو دیکھا بڑھکر ملے، ایک روز کھانے کی میز پر جوشیلی باتیں کیں، اور کہنے لگے کہ بنگلہ دیش اسلامی جمہوریہ ہو کر رہے گا۔

اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ سے جناب ڈاکٹر حافظ محمود غازی بھی سیمینار کے

نمایندے بن کر آئے ہوئے تھے، اسلام آباد میں ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی تھیں، اعظم گڑھ کے سیمینار میں بھی آئے تھے، اس لئے انتہائی عزیزانہ محبت و اخلاص سے ملتے رہے، ان کے چھوٹے بھائی غ۔ا۔ کی بھی ان کے ساتھ تھے، ان میں وہی اخلاص ہے جو ان کے برادر بزرگ میں ہے۔

پاکستان کے اکونومسٹ کے چیف اڈیٹر جناب محمد علی میری کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" کے مداح نکلے، وہ برابر بڑی محبت سے ملتے رہے، پاکستان کے مشہور انگریزی اخبار ڈان کراچی کے ادبی کالم ایریل میں عرصہ دراز سے وہاں کی ادبی تحریکات اور ان کے عروج و زوال پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں، اس کالم کی بعض تحریریں علحدہ سے شائع ہوگئی ہیں، انگریزی اور اردو کے شاعر بھی ہیں، اردو میں اپنی دو کتابیں "توازن" اور "کراچی کی سرگذشت" از راہ عنایت پیش کیں، جن کی عمدہ کتابت و طباعت ہے، یہ ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے ۱۹۷۶ء تک لکھے تھے، ان کا خاندان امروہہ کا رہنے والا ہے، ان کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں ہوئی، کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ام۔اے کیا۔ انگریزی ہی میں صحافت نگاری کرتے ہیں، اسی لئے اردو کی تحریروں میں انگریزی انداز بیان کا بھی اثر ہے، ان کی کتاب "توازن" کی پشت پر پاکستان کے مشہور نقاد ممتاز حسین صاحب کی ایک تحریر ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں: محمد علی صدیقی ترقی پسند تحریک اور اس کی شخصیتوں سے خاص طور پر متاثر ہیں، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اپنی عمر کے اعتبار سے پرانی اور نئی نسل کے درمیان جگہ رکھتے ہیں، ان کا ذہنی تعلق دونوں نسلوں سے ہے، اور ممتاز حسین صاحب کا یہ لکھنا صحیح ہے، ان سے کئی روز برابر ملاقاتیں رہیں جن سے بھی اندازہ ہوا، ان کی کتاب کے مطالعہ سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ وہ اگر ہندوستان کے پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے متاثر ہیں تو امیر خسرو اور اقبال کے بھی مداح ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ ادب کی بڑائی بیانیہ سچائی سے کہیں زیادہ لب و لہجہ کی عمیق اور اچھوتی تراش و خراش میں

ہے، ان کی تحریر اس کا نمونہ ہے، ان کی رائے سے ان کے قارئین اختلاف کر سکتے ہیں، مگر ان کی تحریروں میں جو اچھوتی تراش و خراش ہے، وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے، ان کی کتاب "کروچے کی شخصیت" انگریزی زبان سے ترجمہ ہے، کروچے ایک اطالوی نقاد تھا، اس کا نام تنقید اور جمالیات کے مباحث میں لیا جاتا ہے۔ صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ اردو تنقید اس کے اثرات سے محفوظ نہیں ہے، اس لئے اس کی سرگذشت کا ترجمہ کر کے اس کو اردو ادب میں روشناس کیا ہے۔

انڈونیشیا کے ایک نمایندہ سے ملاقات ہوئی تو وہ دیر تک یہ بتاتے رہے کہ سماترا انڈونیشیا سے آزاد ہو چکا ہے، وہ کاغذات اور اخبارات دکھا کر کہنے لگے کہ انڈونیشیا کی حکومت پر غیر اسلامی ذہن کے لوگ حاوی ہو گئے ہیں، اس لئے سماترا آزاد ہو کر اسلامی جمہوریہ بن گیا ہے، یہ سنکر تعجب ہوا، ایسی خبریں اخبارات میں اب تک نہیں پڑھی تھیں۔

مڈلینڈ، انگلستان سے جناب فضل الرحمن آئے ہوئے تھے، وہاں کے اسلامک سنٹر اور لائبریری کے ڈائرکٹر ہیں، بڑے خاکسار، ملنسار اور خدمت گذار تھے، ہر وقت کوئی نہ کوئی خدمت کرنے کے لئے تیار رہتے، بہت اصرار کر کے اپنے کمرے میں میرے کپڑے دھونے کے لئے لے گئے، مدھیہ پردیش کے رہنے والے تھے، پاکستان آگئے تھے، اب انگلستان میں رہتے ہیں۔

لندن یونیورسٹی کے ہوسٹل میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کا مہمان نو روز تک رہا، اور یہ قیام ہر طرح خوشگوار رہا، لندن یونیورسٹی بند تھی، اس لئے اس کو اندر سے جا کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا، جا بجا اس کی طویل، وسیع اور عریض عمارتوں میں مختلف بورڈ لگے ہوئے تھے، جن سے پتہ چلا کہ علوم کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں، ان سب کی تعلیم یہاں ہوتی ہے، اس سڑک پر ہر قسم کے انسٹی ٹیوٹ بھی

ہودیوں کا بھی تھا، یہاں کی حکومت اور لوگوں کی رواداری ہے کہ جس قسم کا انسٹی ٹیوٹ کوئی قائم کرنا چاہے، اس کی پوری آزادی ہے، اسی سڑک کے ایک پارک میں گاندھی جی کا مجسمہ دیکھا، معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے لندن میں اسی جگہ تعلیم پائی تھی،

مولوی تقی امینی ۱۰راگست کو ہندوستان روانہ ہونے والے تھے، میں ۹راگست کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کی میزبانی کا شکریہ ادا کر کے عزیزی محمد فاتح کے ساتھ ان کے گھر منتقل ہو گیا، جو لندن یونیورسٹی کے ہوسٹل سے سترہ میل پر واقع تھا۔

ہارن چرچ کا قیام عزیزی محمد فاتح کا مکان ۱۰ ہرارسٹ روڈ ایمرسن پارک ہارن چرچ میں ہے، اس کے سامنے جو سڑک تھی، اس پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی، اس لئے جگہ پُرسکون تھی، چاروں طرف انگریزوں کے مکان تھے، مگر ایک پڑوسی دوسرے سے شاید برسوں نہیں ملتا، اس مکان میں آسائش کی ہر چیز تھی۔ زینہ سے اوپر چار بڈ روم تھے، نیچے ایک ڈرائینگ روم، ایک کھانے کا کمرہ، اور ایک باورچی خانہ تھا، تین باتھ روم تھے، مکان کے پیچھے ایک لان تھا، لندن میں اسی قسم کے مکانات عام طور سے ہوتے ہیں، ان کی بیگم نے اپنی خوش سلیقگی سے اس کو بہت صاف ستھرا اور سجا کر رکھا ہے، یہاں آکر قیام کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ خیال تھا کہ لندن میں اچھے دانتوں کا سٹ بن جائے گا، ۱۱راگست کو ایک انگریز ڈینٹسٹ سے پانچ دانت اکھڑوائے، اعظم گڈھ کے چینی دندان ساز سے برابر دانت اکھڑواتا رہا تھا، مجھکو اس کا ہاتھ زیادہ صاف معلوم ہوا، ایک دانت پورا اکھڑ نہ سکا، اس کے ٹکڑے دوسری کوشش میں نکالے گئے، مگر پھر بھی کچھ ٹکڑے رہ گئے، جو دوسرے دندان ساز نے نکالے، مسوڑھے سے تین روز تک برابر خون آتا رہا، کافی فیس دینی پڑی۔

علالت دانت نکلوانے کے بعد نزلہ اور زکام کے ساتھ کھانسی بھی ہونے لگی، تقریباً ایک ہفتہ پریشان رہا، کمزوری آگئی، کہیں باہر جانے کے لائق نہیں رہا، عزیزی محمد فاتح مستعدی سے علاج کرتے رہے، اسی

اثنا میں میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محمد شمیم کے بڑے لڑکے ڈاکٹر جاوید شمیم دو روز ملنے آئے، کراچی سے وہ لندن آگئے ہیں، اور ساؤتھ اینڈ کے ایک اسپتال میں ملازم ہو گئے ہیں، زیادہ تر مذہبی گفتگو کرتے رہے، یہاں رہ کر نماز کے پابند ہیں۔

دریا ٹیمس کے پل کا نظارہ کچھ طبیعت سنبھلی تو عزیزی محمد فاتح ۸راگست کی شام کو مرکزی لندن میں دریائے ٹیمس کے کنارے لے گئے، جس کے پل کے پاس برطانوی پارلیمنٹ کی عمارت ہے، اس پارلیمنٹ کا ذکر اپنی طالب علمی کے زمانے سے سنتا رہا تھا، آنکھوں سے دیکھا تو اس کی ساری تاریخ ذہن میں آگئی، یہاں کیسے کیسے تاریخی فیصلے ہوتے رہے ہیں، یہاں گلیڈاسٹون، ڈسرائیلی، پامرسٹن، لائڈ جارج، چرچل اور اٹیلی نے اپنی خطابت کا کیسا کیسا زور دکھایا ہے، یہیں سے پارلیمانی جمہوریت کی تعلیم حاصل ہوئی، اس کی عمارت خاص وضع کی ہے، جیسی بنی تھی، ویسی ہی رکھی گئی ہے، بڑی لمبی ہے اور اپنی شان میں نرالی ہے، اسی کے بغل میں بگ بن (Big Ben) کا ٹاور ہے جو خاموشی سے پارلیمنٹ اور ملک کی تاریخ بتا رہا تھا، دریائے ٹیمس کے پل اور اس کے ساحل کی چہل پہل میں لندن کی پوری رونق دکھائی دے رہی تھی، لڑکیاں، لڑکے، بڑے بوڑھے، انگریز، ہندوستانی، افریقی، حبشی اور عرب سب ہی طرح کے لوگ طرح طرح کے لباس اور وضع میں آتے جاتے نظر آرہے تھے، موٹروں کا سیلاب بہہ رہا تھا، لندن اپنی پوری شان میں یہیں پر دکھائی دیتا ہے، اسی دریا کے کنارے ایک دیوار پر انگلستان کے بے روزگاروں کی تعداد لکھی ہوئی تھی، جو تقریباً ۳۰ لاکھ تھی، یہ معلوم کر کے اس ملک کی خوشحالی اور اقتصادی برتری پر پانی پھر گیا، عورتیں گھروں سے نکل کر ملازمتوں میں داخل ہونے لگی ہیں، تو اس سے خاندان کی خوشحالی میں اضافہ تو ضرور ہوا، لیکن وہ ملازمت کر کے مردوں کی جگہیں نہ لیتیں اور گھر کی رانیاں بنی رہتیں، تو اتنی بے روزگاری شاید نہ ہوتی، پارلیمنٹ ویسٹ منسٹر میں ہے، اس کے پاس بڑے بڑے ڈیوک اور گرجا کے عہدیداروں نے اپنے اپنے محلات بنوائے تھے، یہیں بڑے بڑے دفاتر

ہیں، اسی سے ملحق ویسٹ منسٹر ایبی اور ویسٹ منسٹر کیتھڈرل ہے، ویسٹ منسٹر ایبی پروٹسٹنٹوں کا بہت بڑا گرجا ہے، یہیں برطانیہ کے تاجداروں کی تاجپوشی ہوئی ہے اور یہیں وہ دفن بھی کئے جاتے ہیں.

بکنگھم پیلس یہاں سے ہم لوگ بکنگھم پیلس کی طرف چلے، اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے تو چوڑی چوڑی سڑکوں پر موٹریں دونوں طرف آجا رہی تھیں سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے پارک تھے جہاں کرسیاں بچھا کر عورت مرد تفریح کر رہے تھے، بکنگھم پیلس نظر آیا تو اس کی جو شان ہونی چاہئے تھی، وہی دکھائی دی طویل، عریض، وسیع اور بلند سب کچھ تھا، جابجا سیکوریٹی گارڈ اسٹیچو بنے کھڑے تھے، پیلس کے سامنے ایک بڑا ٹاور ہے جس پر کچھ لوگوں نے بتایا کہ فرشتوں کے اسٹیچو بنے ہوئے ہیں، یہاں پہونچ کر اس کے ماحول سے یہاں کی قوم کی عظمت و جلالت کی شان نظر آئی، خیال آیا کہ اسپین میں اس وقت الزہرا، الحمراء اور قرطبہ ہوتا، یا بغداد میں قصر فردوس اور قصر التاج دکھائی دیتا، یا ہندوستان میں لال قلعہ کے بنانے والوں کے خاندان کا پرچم اسی طرح لہراتا رہتا، جس طرح بکنگھم کی تعمیر کرنے والی قوم کا نظر آتا ہے تو ہماری شوکت و سطوت کا اثر بھی سیاحوں پر اسی طرح پڑتا، مسلمانوں کے تخت بد کے غم سے بوجھل ہو کر ٹرافلگر اسکوائر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

ٹرافلگر اسکوائر یہ اسکوائر رقبہ کے لحاظ سے تو چھوٹا ہے، مگر اس کے پاس ایک بلند مینارہ پر ٹرافلگر کی لڑائی کے ہیرو نلسن کا اسٹیچو ہے، اور اس کے دونوں طرف ڈذ شیروں کے مجسمے ہیں، نلسن نے شیرین کو نپولین کے زمانہ میں ۱۸۰۵ء میں فرانسیسی بیڑے کو شکست فاش دے کر انگلستان کا نام بلند کیا تھا، یہ بلند مینارہ اور شیر کے مجسمے اس کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس لڑائی کے موقع پر نلسن کا یہ پیام تھا کہ انگلستان اپنے ہر آدمی سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض انجام دے گا، یہ پیام وہاں کے لوگوں کے کانوں میں اب تک گونج رہا ہے، یہ اسکوائر سیاحوں سے برابر بھرا رہتا ہے۔

ڈاؤننگ اسٹریٹ ڈاؤننگ اسٹریٹ دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، ایک پتلی سڑک مڑی تو معلوم ہوا کہ

یہی ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے، اس کو سر جارج ڈاؤننگ نے اپنے لئے بنایا تھا مگر اب برطانیہ کے وزیر اعظم کی قیامگاہ ہے، اس کے چھوٹے دروازہ پر نمبر ۱۰ لکھا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اس کے اندر دو سو کمرے ہیں، جن میں برطانوی کابینہ کے اور وزراء رہتے ہیں، یہیں دنیا کی ساری سیاسی گتھیاں سیاسی عیاریوں کے ساتھ حل کی جاتی ہیں، اسی عمارت کے سامنے سر بفلک عمارتیں تھیں جن پر دولت مشترکہ اور امور داخلہ وغیرہ کے دفاتر کی تختیاں لگی ہوئی تھیں.

ہائڈ پارک وہاں سے ہم لوگ ہائڈ پارک چلے آئے، جو طول و عرض میں بہت بڑا ہے، اس کے کئی حصے ہیں، لندن کے گنجان علاقوں کے رہنے والے یہاں آکر سیر، تفریح، اور ورزش کرتے ہیں اکی تازہ ہواؤں سے اپنی صحت بھی بناتے ہیں، یہ مقرروں کی تربیت گاہ بھی ہے، چھوٹے چھوٹے مجمع کسی نہ کسی کی تقریر سنتے رہتے ہیں، ہم لوگ وہاں پہونچے تو ایک ایرانی صاحب فارسی میں تقریر کر رہے تھے، وہ امام خمینی کے مخالف تھے، یہ پارک بانکوں اور چھبیلوں کی طرب گاہ بھی ہے، ان کی طربناکی کے بعض مناظر کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کرنی پڑیں، اسی کے ساتھ کنگسٹن گارڈن بھی ملا ہوا ہے، جس کی جھیل میں کشتی رانی بھی کی جاتی ہے، ہائڈ پارک کے ایک سرے سے کنگسٹن گارڈن تک ڈو میل کی مسافت بتائی جاتی ہے، پہلے یہیں برطانوی حکمرانوں کا پیلس تھا، بکنگھم پیلس میں پہلی دفعہ ملکہ وکٹوریہ نے اپنی رہائش گاہ بنائی.

ڈاکٹر امان اللہ کی دعوت ۹ راگست کو عزیزی محمد فاتح کے ہمزلف ڈاکٹر امان اللہ نے اپنے گھر مدعو کیا، ان کے ایک بنگلہ دیشی دوست ڈاکٹر عماد احمد بھی آئے، ان کے ساتھ مغربی بنگال کے ان کے ایک عزیز بھی تھے، کھانا بہت لذیذ تھا جس میں سیخ کے کباب بہت لطف و لذت سے کھائے گئے، وہاں زیادہ تر مذہبی گفتگو رہی، ڈاکٹر امان اللہ کی خواہش بھی تھی کہ وہ یہاں ایک مسلمان بن کر رہیں، ڈاکٹر عماد احمد کو دکھ تھا کہ بنگلہ دیش پاکستان سے علٰحدہ ہو گیا، ان کے اندرونی جذبات یہ تھے کہ دونوں ایک دوسرے

سے قریب تر ہو جائیں، اور یہ خیال برابر ظاہر کرتے رہے کہ پاکستان بننے کے بعد مذہبی تعلیم دلانے کی
طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی، بنگلہ دیش کا بھی رجحان اس کی طرف نہیں ہے، اس لیے اچھے مولوی
اور عالم پیدا نہ ہو سکے، جو دونوں بازوؤں کو اسلامی تعلیم دے کر اسلامی اخوت سے منسلک رکھتے،
میری گفتگو زیادہ تر اس پر رہی کہ اچھے مسلمان کے کیا اوصاف ہیں۔

زٹلینڈ ہاؤس ۱۲ راگست کو اعظم گڈھ کے محب مکرم جناب امین الدین کے داماد جناب اختر انیس صاحب
نے اپنے گھر پر مدعو کیا، وہ یہاں ایک بینک میں بہت بڑے عہدیدار ہیں، مارلیوس روڈ پر زٹلینڈ
ہاؤس میں رہتے ہیں، یہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں لندن کے گوناگوں جلوے دکھائی دیتے
ہیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، دونوں طرف صاف ستھرے مکانات نفاست اور خوش سلیقگی کے دل آویز
مناظر، سجی سجائی دوکانیں، آراستہ پیراستہ شوروم، اور بہتر سے بہتر موٹروں کی قطاریں دیکھ کر مغربی
تمدن سے چشم بینا تو نہیں، لیکن ظاہری آنکھیں ضرور خیرہ ہو سکتی ہیں، فورڈ کے موٹر کے کارخانے کی طرف
سے گذرا تو باہر میدان میں موٹریں اتنی پڑی تھیں کہ ہم نے اپنے ملک میں ایک جگہ اتنی سائیکلیں بھی نہیں
دیکھی تھیں، معلوم ہوا کہ اس کارخانہ میں دو ہزار موٹریں روز تیار ہوتی ہیں، ان کی طرح طرح کی قسمیں
دیکھنے میں آئیں، چھوٹی بڑی مال لادنے، دودھ سپلائی کرنے، کوڑے پھینکنے، بڑی بڑی مشینوں
کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والی موٹریں دکھائی دیں، معلوم ہوا کہ یہاں ساٹھ فی صدی
شہریوں کے پاس موٹریں ہیں، جو زیادہ تر یہاں کی بنی ہوئی موٹریں خریدتے ہیں، جاپان، سوئٹزرلینڈ،
اور امریکہ کی موٹریں بھی دکھائی دیں مگر وہ دس فی صدی سے زیادہ نہ ہونگی، یہاں موٹر پارک
کرنا آسان نہیں، بعض اوقات کئی فرلانگ کے بعد ایک موٹر کو جگہ ملتی ہے، اسی لئے بعض جگہوں پر کئی کئی
منزلوں کی عمارتیں موٹروں کے پارک کرنے کے لئے بنادی گئی ہیں، وہاں فیس ادا کرنی پڑتی ہے، سیکوریٹی
گارڈ ٹہلتے رہتے ہیں کہ کوئی موٹر غلط جگہ کھڑی نہ کر دی جائے، اس کے لئے جرمانے ہوتے ہیں، اختر انیس

ایک بہت بڑی عمارت کا ایک فلیٹ خرید لیا ہے،
صاحب کا فلیٹ لندن کے قلب میں ہے،
جس کو فروخت کریں تو بہت بڑے سرمایہ دار ہو جائیں، ان کے لڑکے، لڑکی اور ایک بھانجی سے
ملکر خوشی ہوئی، وہاں ان کے ایک دوست بھی آئے ہوئے تھے، باتیں شروع ہوئیں تو ایسا معلوم
ہو رہا تھا کہ ہم لوگ لندن کے بجائے اعظم گڈھ میں ہیں۔

پُر رونق بازار عزیزی محمد فاتح ساتھ تھے، واپسی میں ان کی موٹر بہت سی سڑکوں کی طرف مڑتی رہی،
اسٹاک ایکسچینج کی عمارت پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ اس میں ۲۸ منزلیں ہیں، یہاں کی کونسل نے بیس بیس
منزلوں کی انتالیس ۳۹ عمارتیں بنا رکھی ہیں، ان ہی کے فلیٹ عام لوگوں کو کرایہ پر دیدیے جاتے ہیں، لندن
میں اسٹرینڈ روڈ بہت ہی پُر رونق ہے، یہاں بڑی بڑی دکانیں اور ہوٹل نظر آئے، دوکانوں کے آگے
شیشے کی دیواریں ہوتی ہیں، ایک اور پُر رونق مارکیٹ آکسفورڈ اسٹریٹ پر ہے، اس کی دوکانیں تو محل معلوم
ہوئیں، یہ اسٹریٹ ریجینٹ اسٹریٹ اور پکاڈلی مرکس سے ملی ہوئی ہے، رائل اکیڈمی کے پاس برلنگٹن
ارکیڈ میں شیشوں کی چھت کے اندر تقریباً ۲۰ دوکانیں ہیں، جو شیشوں کا محل معلوم ہوتی ہیں، اس کے پاس
ہی باونڈ اسٹریٹ ہے، جہاں آکر دنیا کے متمول ترین آدمی خریداری کرتے ہیں، پکاڈلی کے آخر میں جرمین اسٹریٹ
ہے، جہاں مردوں کے قیمتی سے قیمتی لباس تیار ہوتے ہیں، پکاڈلی کے شمال میں سیک ویل اسٹریٹ اور
سویل روڈ میں جہاں سلائی کے بہترین کام ہوتے ہیں، پکاڈلی کے پورب جانب چیرنگ کراس روڈ پر پرانی
کتابوں کی ایک دوکان ہے، جہاں کبھی کبھی بہت نادر کتابیں مل جاتی ہیں۔

مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہند سے ملاقات مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہند ۲۰ راگست کو ہندوستان
سے لندن تشریف لائے، لندن کے اسلامک مشن کا بیسواں سالانہ
جلسہ برمنگھم میں ہونے والا تھا، اسی میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے، اس اجتماع کا خاص موضوع
یہ تھا "اسلام اور مغرب" میری طبیعت خراب رہی، اس لئے ان سے فوراً جا کر نہ مل سکا، ملنے کی بیتابی

میں ٹیلیفون پر ان سے باتیں کرتا رہا، ۲۴ر اگست کی شام کو یو۔ کے۔ اسلامک مشن کے دفتر میں ان سے
عزیزی محمد فاتح کے ساتھ نیاز حاصل ہوسکا، وہیں وہ قیام پذیر تھے، وہاں ہندوستان اور پاکستان کے
کچھ لوگ بھی ان سے ملنے آگئے تھے، بڑی اچھی صحبت رہی، گفتگو کا موضوع مختلف رہا، ایران کے
اسلامی انقلاب کا بھی ذکر آگیا، مختلف رائیں سننے میں آئیں، جن میں ایک یہ بھی تھی کہ اس کو خالص
اسلامی انقلاب سمجھنا صحیح نہیں، ایران کے اپنے مقامی مسائل ہیں جن کو اس انقلاب کے ذریعہ سے حل
کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ بھی سننے میں آیا کہ طہران پہلے بداخلاقی کا اڈہ بنا ہوا تھا، لیکن وہاں خالص
اسلامی رنگ نظر آتا ہے، عورتیں ساتر لباس میں دکھائی دیتی ہیں، کسی قسم کی بے حیائی نظر نہیں آتی، اس کا
بھی ذکر آیا کہ پاکستان میں کچھ لوگ اس انقلاب کو اسلامی انقلاب سمجھتے ہیں، تو کچھ لوگ ایسا سمجھنے میں
تامل بھی کر رہے ہیں، اسی گفتگو کے درمیان پاکستان کے اخبار "جسارت" کے اڈیٹر جناب صلاح الدین کی
کتاب "ایرانی انقلاب" کیا کھویا کیا پایا "کا حوالہ دیا گیا، تو اس کے مطالعہ کرنے کا اشتیاق ہوا، اس
پرلطف مجلس کے بعد ہم لوگ ایک دعوت میں گئے، جو مفتی برکت اللہ صاحب کی طرف سے تھی، ان سے
سمینار میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، وہ لندن میں بی۔ اس۔ سی کی تعلیم پا رہے ہیں، مگر ان کے
ملنے جلنے کا حلقہ وسیع ہے، وہ پرتاب گڈھ یوپی کے رہنے والے ہیں، ان کے خاندان والوں کا کاروبار
بھیونڈی بمبئی ہے، وہ اعظم گڈھ دارالمصنفین بھی جاچکے ہیں، ایک روز وہاں قیام کیا تھا، مولانا ابواللیث
کے قدرداں ہیں، دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے تھے جن سے لندن میں ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن
نظر آرہا تھا، اس دعوت میں پروفیسر ڈاکٹر زین العابدین بھی شریک ہوئے، دہلی کے رہنے والے تھے، کچھ دنوں
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں انگریزی کے استاد رہے، آج کل امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔

کیمبرج

۲۵ر اگست کو کیمبرج عزیزی محمد فاتح کے ساتھ گیا، جو ان کے گھر سے ۵۳ میل کے فاصلہ پر واقع
ہے، اس یونیورسٹی میں پاکستان کی طرف سے ڈاکٹر معزالدین اقبال چیئر کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت

سے مامور ہیں، وہ یہاں آنے سے پہلے اقبال اکیڈمی پاکستان کے ڈائرکٹر تھے، ان سے مشرقی پاکستان کراچی لاہور
اور اسلام آباد میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان سے بڑے مخلصانہ تعلقات ہیں، ان کے خسر پروفیسر محمد مسلم
مرحوم میرے استاد بھی تھے، ان کو لندن میں میری آمد کی خبر ہوئی تو ان کا اصرار ہوا کہ میں ان کے یہاں
آکر دو چار روز قیام کروں، یہ تو ممکن نہ ہوسکا، لیکن کیمبرج یونیورسٹی دیکھنے اور ان سے ملنے کے اشتیاق
میں روانہ ہوا تو ۵۳ میل کا یہ سفر بہت خوشگوار رہا، راستہ کی سڑکیں ایسی صاف ستھری تھیں کہ جی چاہتا کہ
اتر کر تھوڑی دیر اس پر چہل قدمی کی جائے، دونوں طرف کھیت کیا تھے معلوم ہوتا تھا کہ ان پر مٹی کی چادریں
بچھی ہوئی تھیں، جھاڑ جھنگل سے بالکل پاک، صاف، مسطح اور ہموار تھے، ان کے ارد گرد درخت بھی تھے،
جو قد میں برابر نظر آتے، شاید ان کی بھی دیکھ بھال اور کاٹ چھانٹ پورے طور پر ہوتی رہتی ہے، راستے
میں چھوٹے چھوٹے مکانات لندن ہی کی طرح بنے ہوئے تھے، کہیں گھنی آبادی نظر نہیں آئی، ہندوستان
کے گاؤں کی طرح ٹوٹے پھوٹے گرے پڑے مکان بھی نہیں دکھائی دیئے، کیمبرج میں داخل ہوا تو دونوں
طرف درختوں کی قطاریں ایسی تھیں کہ موٹر شاداب مرغزار سے گذرتی معلوم ہوئی، ڈاکٹر معزالدین
اپنے مکان سے باہر سڑک پر بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، ان کا مکان لندن ہی کے وضع کا تھا،
زیادہ بڑا تو نہ تھا، لیکن بہت ہی آرام دہ اور راحت کے تمام سامانوں سے آراستہ تھا، سامنے بہت وسیع
لان تھا، ان سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کی باتوں میں بڑی گرم جوشی تھی، انھوں نے کیمبرج آنے کی پوری
تفصیل بتائی جس سے معلوم ہوا کہ ان کی حیثیت پاکستان کے ایک وزیر کے برابر ہے، یہاں اپنی علمی
سرگرمیاں بھی بتائیں، اب وہ یونیورسٹی کے فیلو بھی بنا دیئے گئے ہیں جو بہت بڑا اعزاز ہے، ان کی بیگم
ام۔ ایڈ ہیں، بہت مذہبی اور گھریلو خاتون ہیں، انھوں نے بہت عمدہ ہندوستانی کھانا پکا کر ہم لوگوں کے
کام و دہن کو لذت آشنا کیا، ان کی ایک چھوٹی بچی بھی تھی، جس نے کیمبرج میں رہ کر کلام پاک ختم کیا،
اور یہیں گھر پر اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا ہے، گفتگو میں اس تشویش کا بھی ذکر آیا کہ یہاں آکر والدین

مالی حیثیت سے بہتر ضرور ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے بچے یہاں رہ کر اپنی زبان، اپنے مذہب اور تہذیب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر معزالدین کی بیگم نے بتایا کہ وہ بچوں کے لئے اسلامی کہانیاں لکھنا چاہتی ہیں، تاکہ ان کو اپنے مذہبی بزرگوں سے واقفیت ہو، میری کتاب "ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں" کا بھی ذکر آیا۔

ڈاکٹر معزالدین نے یہ بھی بتایا کہ کیمبرج میں ایک اسلامک اکیڈمی بھی قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، پھر ایک بروشیر دیا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آج کل مذہب اور سیکولرزم میں بڑا تصادم پیدا ہو گیا ہے، ایک زمانہ تھا کہ دنیا میں مسلمان روحانی، علمی اور مادی زندگی کے رہنما بنے ہوئے تھے، ان کے اس عروج اور پھیلاؤ کی وجہ اسلام کی قوت تھی، اسلام نے مسلمانوں کے نہ صرف اخلاق کو پاکیزہ بنایا بلکہ ان میں روحانی گرمی بھی پیدا کی، ان کی علمی صلاحیتوں کو تیز تر کیا، اور اس کے لئے بھی معاون ہوا کہ مسلمان نے حالات کو اپنا کر ان میں اسلامی رنگ پیدا کریں، ان میں زوال اس وقت آیا جب ان کے اسلامی عقائد کمزور پڑ گئے اور اسلام سے ان کی عقیدت محض زبانی رہ گئی، ان کا علمی ادراک اور قوت عمل سرد پڑ گئی، اور ان پر بیرونی حالات کا استیلا ہونے لگا، ایثار، قربانی اور جہاد کے جذبے کے بجائے ذاتی مفاد پرستی، تعیش پسندی اور بے راہ روی پیدا ہو گئی، ان کے خیالات میں جمود پیدا ہو گیا، وہ روحانیت سے بیگانہ ہو گئے، ان پر علمی افلاس چھا گیا، اس روحانی انتشار سے ان کا سیاسی زوال لازمی تھا، بغداد کے سقوط کے بعد مغرب میں سیکولر قوتیں ابھرنے لگیں، مابعد الطبیعات سے نیچرل سائنس کی علیحدگی ہونے لگی، خیالات کی یگانگت ختم ہو گئی، تعلیم کی تحصیل میں انتشار پیدا ہو گیا، زندگی کے فلسفہ کی نوعیت میں فرق آنے لگا، اس کے نتائج کا خمیازہ آج ہم بھگت رہے ہیں، سیکولرزم اور مادیت اب ساتھ ساتھ چل رہی ہے Pragmatism اس کے ساتھ آئی، سیکولر زندگی میں ربانی تخیل نظر انداز ہو گیا، اب زور مادی فلاح پر دیا جا رہا ہے، ٹکنالوجی ہر جگہ کامراں بن کر چھا گئی ہے، زندگی کی

تقدیس گم ہو کر رہ گئی ہے، وہ عقیدہ جاتا رہا جو نامعلوم روحانی حقیقت اور خدا پر مبنی تھا، ان عقیدوں کی تلاش ہوئی جو علمی طور پر معلوم اور ثابت ہو سکے، یہ خیال حاوی ہو گیا کہ معاشرہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے مذہبی عقائد میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، مگر نسلیں ان ہی عقائد سے مطمئن ہو سکتی ہیں جو معاشرہ کی بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دے سکیں، اس طرح سیکولر تخیلات کی قدریں بڑھ گئیں، اور یہ روحانیت کی بنیاد پر قائم ہونے والے عقیدوں پر اس طرح حملہ آور ہوئیں کہ مذہب کو اس سے زیادہ حیثیت نہیں دی جانے لگی کہ یہ انسان کی محض ایک معاشرتی پیداوار ہے، مسلمان جہاں برسر اقتدار ہیں، وہاں بھی انھوں نے تعلیم کا ایک ایسا سیکولر نظام قائم کیا ہے، جس سے وہ تیزی کے ساتھ علمی اور مادی ترقی کی طرف مائل ہوں، اس کی مخالفت ان لوگوں نے کی جو اسلام کی روایاتی تعلیم کے قائل ہیں، اور وہ اس کو کسی حال میں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس طرح اس وقت مسلمانوں کی دنیا ایک ایسے میدان جنگ میں بدل گئی ہے جہاں سیکولر اور مذہبی تعلیم کی لڑائی جاری ہے، اس تجزیہ کے بعد یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو، مسلمانوں کے وجود اور انفرادیت کو قائم رکھ کر ان کو ترقی یافتہ کیسے بنایا جا سکتا ہے، مکہ مکرمہ میں ۱۹۷۷ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں جو پہلی عالمی کانفرنس ہوئی تھی، اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ سیکولر تخیلات کے بجائے ایسے تخیلات مرتب کئے جائیں جن کی بنیاد مذہب پر ہو، علوم دو حصوں میں تقسیم کئے جائیں، ایک جو ربانی ہو، دوسرا وہ جو اکتسابی ہو، اسی کی روشنی میں موجودہ نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو تعلیم کے ہر مرحلہ پر مفید ثابت ہو، اس میں روایاتی اور جدید نظام تعلیم دونوں کی خوبیاں ہوں تاکہ یہ طالب علم کی زندگی سے ہم آہنگ ہو، ایسی تعلیم کے لئے کتابیں اور تربیت یافتہ اساتذہ تیار کئے جائیں، اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے مسلمان ہم خیال اسکالروں سے مدد لی جائے، مسلمانوں کی مختلف تنظیموں سے تعاون کیا جائے، مسلمان ممالک کی ہمدردی حاصل کی جائے، اس کے لئے کانفرنس، سیمینار اور سیمپوزیم منعقد کئے جائیں، جرائد کے ذریعہ ایسے منصوبوں کی ترویج ہو، جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں کے غیر مسلموں سے رابطہ پیدا

کر کے ایسی فضا تیار کی جائے جس سے وہاں کے مسلمانوں کا کلچر اور وجود محفوظ ہو سکے، ان تجویزوں کو عمل میں لانے کے لئے ایک ریسرچ سنٹر قائم ہو، جو کسی مسلم ملک میں نہ ہو، تاکہ وہاں کے اثرات سے آزاد رہ کر غیر جانبداری کے ساتھ علمی تحقیقات میں یہ مصروف رہے، اور یہاں مسلم اور غیر مسلم ممالک دونوں کے لوگوں کی رسائی آسانی سے ہو سکے، اور غیر مسلم دانشوروں سے رابطہ پیدا کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو، ایسا ادارہ اسلامی اکیڈمی کے نام سے کیمبرج میں قائم ہو۔

ڈاکٹر معز الدین نے بتایا کہ اس کے محرک ڈاکٹر علی اشرف ہیں جو مشرقی پاکستان کے رہنے والے اور کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے صدر شعبہ تھے، مگر اب پاکستان میں رہتے ہیں، بڑی اچھی تجویز ہے، خدا کرے یہ عمل میں آجائے، اس بروشیر کے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ مسلمان اہل فکر و نظر اس طرف مائل ہو رہے ہیں کہ مغربی تمدن کے اثرات سے جو کچھ انھوں نے کھویا ہے وہ پھر پالیں، اس ذہنی بیداری سے پورا فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر معز الدین کے گھر پر خوشگوار گھنٹے گذار کر ہم لوگ کیمبرج یونیورسٹی دیکھنے چلے، معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ۳۴ کالج ہیں جن کا دیکھنا ایک روز میں ممکن نہیں، اور وہاں موسم گرما کی چھٹی بھی تھی، خیال ہوا کہ خاص خاص کالجوں پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ ڈاکٹر معز الدین نے کہا کہ پہلے وہ مکان دیکھا جائے گا، جہاں علامہ محمد اقبال اپنی تعلیم کے زمانہ میں رہا کرتے تھے، وہاں جلد از جلد پہونچنے کا اشتیاق بڑھ گیا، یونیورسٹی پہونچنے کے لئے کیمبرج کے بازار سے گذرنا پڑا، سڑکیں لندن کی طرح چوڑی تو نہ تھیں، مگر بڑی بڑی دوکانیں لندن ہی کی طرح سجی سجائی ہوئی تھیں، جن کے آگے شوروم کے شیشے کیا تھے، بلکہ شیشوں کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں، صفائی ستھرائی بھی لندن کی طرح تھی، ہم لوگوں کے قدم تیزی سے علامہ محمد اقبال کی سابق قیامگاہ کی طرف بڑھے، جو ایک پتلی سڑک پر واقع ہے، اس پر اب چھوٹا سا کتبہ پاکستانی حکومت کی طرف سے لگا دیا گیا ہے، وہ کمرہ تو دیکھ نہ سکے، جہاں علامہ رہا کرتے

تھے، مگر اس مکان کی کئی تصویریں عزیزی فاتح نے لیں، یہ جگہ اپنی صفائی کے لحاظ سے چمک رہی تھی، بغل میں اور آمنے سامنے بڑی بڑی عمارتیں تھیں، وہاں سے چل کر سینٹ جان کالج، پھر ٹرینیٹی کالج پھر پمبروک کالج، پھر کنگس کالج، پھر کوینس کالج کی سیر کی، باہر ان کے میدانوں میں چہل قدمی کرتے رہے، ہر کالج کے ساتھ ایک گرجا منسلک ہے، جس کی تعمیر میں اخراجات کی فراوانی اور تعمیری فن کی خوش سلیقگی دکھائی دے رہی تھی کنگس کالج کے ساتھ جو بہت بڑا گرجا ہے، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے فن تعمیر کا بہت عمدہ نمونہ دکھائی دیا، سینٹ جان سینٹ بینٹ اور سینٹ اڈورڈ چرچ وغیرہ کی عمارتوں سے کالج کی عمارتیں دبی نظر آئیں، ان گرجاؤں کو دیکھکر اندازہ ہوا کہ اس زمانہ میں مذہب کی کتنی بڑی اہمیت تھی، مگر اب کالج کا ہر گرجا زیادہ تر سونا ہی پڑا رہتا ہے، معلوم ہوا کہ بہت کم طلبہ اس کے اندر دکھائی دیتے ہیں، اور گرجے تو بند تھے، مگر ایک چھوٹا سا گرجا کھلا ہوا تھا، اس کے اندر ہم لوگ چلے گئے، اس کے باہر لکھا ہوا تھا کہ یہاں گذشتہ چھ سو برس سے عیسائی عبادت کرتے آئے ہیں، وہاں آرام دہ بنچیں ضرور بچھی ہوئی تھیں، مگر اس کے اندر سے دو چار ہی آدمی آتے جاتے دکھائی دیئے، ہر کالج کی عمارت باوقار اور جاندار نظر آئی، ٹرینیٹی کالج کے احاطہ میں ہم لوگ کھڑے تھے تو اس کی بنانے والی قوم کی شوکت اور سطوت کا اثر پڑا، اس کے بڑے بڑے پھاٹک، گیلری، کمرے، دیواریں، ستون اور فوارے وغیرہ دیکھکر ایسا معلوم ہوا کہ ہم آگرہ، لاہور اور دہلی کے مغل محلات میں کھڑے ہیں، بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوا کہ ہم لال قلعہ دہلی کے دیوان عام میں ہیں، اس یونیورسٹی کی تاریخ ۱۳۰۹ء سے شروع ہوتی ہے، پہلے تو اس کی ابتدا معمولی انداز میں ہوئی تھی، مگر رفتہ رفتہ ایسی درسگاہ بن گئی، جس پر شاید دنیا کو بھی ناز ہو، علم کی کون ایسی شاخ ہے جس کی تعلیم یہاں نہ ہوتی ہو، کلاسیکس، ارکیٹکچر، ہسٹری آف آرٹ، مذہب جدید اور ازمنۂ وسطیٰ کی زبانیں، تاریخ، تعلیم، قانون، انجینیرنگ، ریاضیات، اورینٹل اسٹڈیز اور ان کی مختلف شاخوں کی فیکلٹیاں علحدہ علحدہ قائم ہیں، اورینٹل اسکول، اسکاٹ پولر انسٹیٹیوٹ یونیورسٹی، بوٹانیکل گارڈن، فٹز ولیم میوزیم، اور سینٹ کی عمارتیں باہر سے

دیکھیں، تین کالج لڑکیوں کے لئے علٰحدہ ہیں، لائبریری کی عمارت بھی بہت شاندار نظر آئی، اس کے پھاٹک کا فنِ تعمیر خاص طور کا ہے، اس کے اوپر جو پُرشکوہ مینارہ ہے اس کو دیکھ کر جی چاہا کہ یہاں دیر تک کھڑا رہوں، ڈاکٹر معز الدین سے معلوم ہوا کہ برطانیہ میں جس کتاب اور رسالہ کی اشاعت ہوتی ہے، اس کا ایک نسخہ لازمی طور پر یہاں بھیجا جاتا ہے، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس علمی خزانہ کے اندر جاکر آدمی گم ہو جاتا ہے، جو کتاب بھی طلب کی جاتی ہے، کمپیوٹر سے معلوم کر لیا جاتا ہے کہ یہ الماری میں اپنی جگہ پر موجود ہے کہ نہیں، جس صفحہ کا فوٹو اسٹیٹ لینا چاہیں، پانچ دس منٹ میں لے لیا جاتا ہے ان عمارتوں کی سیر کرتے ہوئے ہم لوگ ایک کوٹھے پر جا بیٹھے جو یونیورسٹی سنٹر کہلاتا ہے، اس میں طلبہ کے لئے خالی اوقات میں کھانے پینے، ٹی۔ وی دیکھنے، لکھنے پڑھنے کے علٰحدہ علٰحدہ سجے سجائے کمرے تھے، ایک مہمان خانہ بھی تھا، یہاں بیٹھ کر کیمبرج کی ندی کی کشتی رانی سے بھی لطف اٹھایا جاتا ہے، ٹھیک اس کے سامنے ایک مکان کے متعلق بتایا گیا کہ یہ ڈارون کا مکان تھا، جس کا یہ نظریہ ہے کہ "انسان بندر کی نسل سے ہے" کیمبرج کیم ندی پر واقع ہے جس پر چھوٹے بڑے پل بنے ہوئے ہیں، اسی لئے یہ کیمبرج کہلاتا ہے، اس ندی میں کشتی رانی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں، یونیورسٹی دیکھ کر انگلستان کی عظمت اور شوکت کا جو اثر پیدا ہوا تھا وہ یکایک ایسے منظر کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے زائل ہو گیا جس سے میری نہیں بلکہ انسانیت کی گردن شرم سے جھک گئی، اس ندی کے ساحل پر ایک جوان لڑکی کو ایک لڑکے کے ساتھ پورے ہجوم کے سامنے ایسی حالت میں دیکھا جو ہندوستان کی ایک بازاری عورت بھی اپنے لئے کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتی،

خیال ہوا کہ اس خود دار اور غیرت مند قوم کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے کہ برسرِ عام ایسی فحاشی کو روک نہیں سکتی، رات ہو رہی تھی، ہم لوگوں کو واپس جانا تھا، ڈاکٹر معز الدین اور ان کی بیگم صاحبہ کی خاطر داری اور میزبانی کی عطر بیزیوں سے معطر ہو کر ان سے رخصت ہونے لگا تو اپنے خسر پروفیسر محمد مسلم کا ایک رسالہ "حریفانِ بادہ پیما" پڑھنے کے لئے ساتھ کیا، واپسی میں رات کو موٹر سڑک پر سے گذر رہی تھی تو شاہراہ

کی لکیر جا بجا چمکتی نظر آئی، عزیزی فاتح نے بتایا کہ یہ چمک بلی کی آنکھ کہلاتی ہے، جو فاسفورس جیسی چیز سے اس لئے بنائی گئی ہے کہ جہاں روشنی نہ ہو وہاں یہ سڑکوں پر روشنی کا کام دے، یہ انگلستان کی خاص ایجاد ہے جس کو امریکہ نے بھی اپنایا ہے، راستہ میں ہر ایک میل پر اور تمام راستوں کی طرح ٹیلیفون کا پول لگا ہوا تھا، تاکہ کوئی موٹر خراب ہو تو کارخانہ کو اطلاع دے کر مدد طلب کر لی جائے، جس کے بعد ایک بڑی گاڑی فوراً آجاتی ہے، یا تو یہ اس کی مرمت کر دیتی ہے یا اس کو پیچھے باندھ کر لے جاتی ہے، یا اگر پہیے خراب ہوں، تو اس کو اپنے اوپر لاد لیتی ہے، ایسی موٹر Break down carriage کہلاتی ہے۔

دوسرے دن صبح کو "حریفانِ بادہ پیما" پڑھنا شروع کیا، اس میں بہار کی بعض شخصیتوں کی قلمی تصویریں تھیں، ان کو پڑھ کر طالب علمی کے زمانہ کے لوگ آنکھوں کے سامنے آ گئے، اس میں پٹنہ یونیورسٹی کے مشہور سابق استاد ڈاکٹر علیم الدین مرحوم پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو پڑھ کر متاثر ہوا، وہ ہم لوگوں کے مشفق استاد تھے، اس رسالہ کی زبان اچھی ہے، کیوں نہ ہوتی، اس کے مصنف نے زندگی بھر فارسی اور اردو پڑھائی تھی

آکسفورڈ کی سیر ۲۹ راگست کو عزیزی محمد فاتح آکسفورڈ لے گئے، وہاں ہم لوگ ۳۰ میل کی مسافت طے کر کے پہونچے، سڑکیں ویسی ہی تھیں جیسی کیمبرج کے راستے میں تھیں، کھیت بھی ویسے ہی تھے جیسے برنگم جاتے دیکھے تھے، ایک کھیت کو تین طاقتور گھوڑوں کے ذریعہ سے جوتتے دیکھا، پیچھے ایک ہلکی مشین لگی ہوئی تھی، جو زمین کو کھود رہی تھی، اس کو ایک کسان اسی طرح پکڑے ہوئے تھا جس طرح ہمارے یہاں ہل پکڑا جاتا ہے، عام طور سے یہاں کھیتی ٹریکٹر کے ذریعہ سے ہوتی ہے، راستے کے بعض مناظر میں کہیں کہیں کشمیر کی جھلک دکھائی دی، کچھ پہاڑیوں پر سبزے ایسے نظر آرہے تھے جیسے وہ خودرو نہیں ہیں، بلکہ ان ہی سے یہ پہاڑیاں ڈھانک دی گئی ہیں، خیال آیا کہ اس ملک کے رہنے والوں نے اسکی سرزمین کو کس محنت سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے، پھر جو قوم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی محنت کی عادی ہو، اس کو زندہ رہنے کا حق ہے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی طویل روش کو طے کر رہے ہیں آکسفورڈ

درختوں اور سبزہ زاروں کے سایہ میں پہونچے، یہاں ڈاکٹر معزالدین کی طرح کوئی رہنمائی کرنے والا نہ تھا، ایک گائڈ بک آکسفورڈ کلر کے ذریعہ سے سب کچھ دیکھنے کی کوشش کی، کیمبرج یونیورسٹی آکسفورڈ کے بعد قائم ہوئی، اس لئے وہاں وہی ساری چیزیں قائم کرنے کی کوشش کی گئی، جو آکسفورڈ میں تھیں، دونوں کے قائم کرنے والے زیادہ تر مذہبی پیشوا تھے، اسی لئے دونوں جگہوں میں بعض کالج کے نام بھی اسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں، مثلاً آکسفورڈ یونیورسٹی کے کالجوں کے نام یہ ہیں:

جیسس کالج، کرائسٹ کالج، ٹرینیٹی کالج سینٹ جان کالج سینٹ ایڈمنڈ ہال کالج، سینٹ کیتھرائن کالج، سینٹ پیٹر کالج اور ہر کالج کے سامنے شاندار گرجا بھی بنا ہوا ہے، میری چرچ یونیورسٹی کا شاید سب سے بڑا گرجا ہے، ایک بوڑھی عورت اس کے پھاٹک پر تمام لوگوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے بیٹھی نظر آئی، مگر دو چار ہی لوگ آتے جاتے دکھائی دیے، آکسفورڈ علوم و فنون کا سرچشمہ ضرور بنا ہوا ہے، مگر بڑے بڑے گرجاؤں کے باوجود یہاں سے عیسائیت شاید جلاوطن ہو چکی ہے، ہم لوگوں کی موٹر کرائسٹ چرچ کالج کے پاس جاکر رکی تھی، اس کے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو ایک بڑے لان میں جاکر کھڑا ہو گیا، جہاں چاروں طرف کالج کی عمارتیں تھیں، بیچ میں فوارہ تھا اور اسی پر کسی کا اسٹیچو تھا، یہ یونیورسٹی کا سب سے بڑا کالج ہے، کیمبرج سے زیادہ ہی یہاں کالج ہوں گے، کرائسٹ چرچ کالج کے سامنے پمبروک کالج تھا اوریل کالج، مرٹن کالج، تفیلڈ کالج، ووسٹر کالج آل سولز کالج، برٹ فورڈ کالج اور نیو کالج وغیرہ پر ایک سرسری نظر ڈال کر بوڈلین لائبریری دیکھنے کے لئے بے چین ہوا، اس کے کیٹلاگ سے برابر استفادہ کرتا رہا ہوں، یہ ریڈکلف اسکوائر میں ہے، اس کے ریڈنگ روم کے پاس پہونچ گیا، جو ایک مدور عمارت ہے، اس کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے، شاندار اور مستحکم عمارت ہے، اس کا دروازہ بند تھا، مگر میں اس کے زینے پر جاکر تھوڑی دیر کھڑا ہو گیا، اسی کے بغل میں بوڈلین لائبریری کی بہت عریض، طویل، وسیع اور بلند

عمارت ہے، اس کے بڑے پھاٹک اور ضخیم بلند ستون دیکھ کر اس کی بنا ڈالنے والوں کے قوی ہیکل ہونے کا اثر پڑا، اس کی تعمیر میں وہی چیز نظر آئی جو ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی عمارتوں میں دکھائی دیتی ہے، استحکام، صلابت، عظمت اور شوکت وغیرہ، پھاٹک بند تھا، اندر جاکر دیکھنے کا موقع نہ ملا، تشنہ واپس ہوا، خیال آیا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی گذشتہ اگست میں اسی یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کا افتتاح کر گئے ہیں، ان کے یہاں آنے سے ان کے وقار اور عزت میں تو اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہ اپنی برکت یہاں چھوڑ گئے ہوں گے، جہاں ان کا لکچر ہوا، اس جگہ کو کوئی بتانے والا نہ تھا۔

آکسفورڈ میں آٹھویں صدی عیسوی سے ایک کونونٹ میں تعلیم شروع ہو گئی تھی، مگر اس یونیورسٹی کا پہلا باضابطہ چارٹر ۱۲۱۴ء میں ملا، اس وقت سے اب تک کالجوں اور شعبوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، بڑے بڑے دولت مند اپنی دولت اس کے لئے وقف کرتے رہتے ہیں، اسی لئے اس کی ترقی برابر جاری ہے، مگر یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پہلے یہاں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی، شاید مذہبی پیشواؤں نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی؛ وہ انیسویں صدی کے شروع سے یہاں تعلیم پانے لگی ہیں، پھر بھی ان کی تعلیم کے لئے علیحدہ انتظام تھا، اور اب تک ان کے چار کالج علیحدہ ہیں، اب تو وہ آزاد ہیں کہ جس کالج میں چاہیں تعلیم حاصل کریں، اس یونیورسٹی تک ان ہی لڑکوں اور لڑکیوں کی رسائی ہوتی ہے جن کا دماغ اور ذہن واقعی بہت اچھا ہے بہت اونچے مارکس کی بنیاد پر ان کا داخلہ ہوتا ہے، اوسط درجہ کے طالب علم تو نیچے ہی درجوں میں تعلیم پاکر اپنی تعلیمی زندگی ختم کر دیتے ہیں، انگلستان میں تعلیم کونسل کے اسکولوں میں مفت اور جبری ہوتی ہے، ان اسکولوں کی تعلیم کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے، ان میں O Level یعنی Advanced level سے پہلے کوئی امتحان نہیں ہوتا ہے، سولہ [16] سال تک کے لڑکوں

اور لڑکیوں کو اسکول جانا لازمی ہے، وہ جب چاہیں اسکول چھوڑ دیں، ان کو سرٹیفکٹ دیدیا جاتا ہے کہ اتنے سال تک ان کی تعلیم ہوئی، اس کے بعد جو چاہے O Level کا امتحان دے ان کے مارکس اچھے ہوتے ہیں تو A Level یعنی Advanced Level کے کلاس میں داخل ہو سکتے ہیں، اگر اس کے امتحان میں اچھے مارکس حاصل کرتے ہیں تو یونیورسٹی میں لئے جاتے ہیں، مگر زیادہ تر طلبہ O-Level سے پہلے ہی تعلیم چھوڑ کر کاروبار، کاشتکاری، صنعت وحرفت یا چھوٹی چھوٹی ملازمتوں میں لگ جاتے ہیں، حکومت بھی اعلیٰ تعلیم کی زیادہ ترغیب نہیں دیتی، تاکہ چھوٹے چھوٹے کاروبار، دوکانوں، کارخانوں اور مزدوری کے لئے نوجوان آسانی سے مہیا ہوتے رہیں، اچھے لڑکے کونسل اسکولوں کے بجائے پبلک میں کثیر رقم ادا کرکے پڑھتے ہیں، اور وہی اچھے مارکس پاکر یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں، اور ان میں جو نسبتاً اور بھی اچھے ہوتے ہیں، ان کا داخلہ کیمبرج اور آکسفورڈ میں ہوتا ہے، ان دو یونیورسٹیوں میں عموماً بہت اچھے لڑکے پہونچتے ہیں،

آکسفورڈ دو ندی (Ford) آئی سس (Isis) اور چرول (Chirwal) پر واقع ہے، شروع میں ان دونوں ندیوں سے بیل زیادہ پار ہوا کرتے تھے، اس لئے اس کا نام آکسفورڈ ہوگیا، اس تعلیمی مرکز میں موٹروں کے بھی کارخانے ہیں، جن سے آبادی بڑھتی جارہی ہے، یہاں کی بڑی بڑی عمارتوں میں ازمنہ وسطیٰ کے آرٹ کے اچھے نمونے دکھائی دیتے ہیں، ان کو صاف ستھرا اور اپنی پرانی وضع پر قائم رکھکر اس قوم نے اپنی زندگی کی تابناکی کا ثبوت دیا ہے، آکسفورڈ چھوڑتے وقت خیال آیا کہ ہندوستان میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں، اور دوسرے خاندانی حکمرانوں نے پورے ملک میں بڑے بڑے مدارس قائم کئے، مگر وہ سب مٹ گئے، جو ان کے اخلاف کی نااہلی اور ناکارہ پن کی دلیل ہے، مگر آکسفورڈ اور کیمبرج صدیوں سے اپنی شاندار اور جاندار روایتوں کے ساتھ قائم ہے، پھر کیوں

نہ اس قوم کے کارناموں سے دنیا متاثر ہو،

واپسی میں لندن پہونچ کر ہماری موٹر آلڈگیٹ سے گذری جہاں زیادہ تر بنگلہ دیش کے مسلمان کاروبار کرتے ہیں وہاں کی سڑکوں پر وہی آلودگی اور گندگی دیکھی، جو برصغیر کی سڑکوں پر پائی جاتی ہے، یہ دیکھکر دکھ ہوا کہ لندن کی زندگی کے روشن پہلوؤں سے یہ لوگ کیا متاثر ہوتے کہ لندن کو اپنے سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انگلش چینل کے ساحل کی سیر

۳۱ راگست کو عزیزی فاتح انگلش چینل کے ساحل پر لے گئے، جوان کے گھر سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر ساوتھ اینڈ میں تھا، راستے میں دیہی علاقے بھی ملے، جن کی سڑکیں لندن ہی کی طرح تھیں، یہاں شہر اور گاؤں کی سڑکوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، جگہ جگہ فارم بھی دیکھے، ساحل پر پہونچے تو تقریباً دو میل تک مسلسل موٹریں کھڑی تھیں، جن پر لوگ تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے، اس ملک میں تفریح ویسی ہی سنجیدگی سے کی جاتی ہے، جس طرح یہاں کام کیا جاتا ہے، پورا ساحل سجا سجایا ہوا تھا، مضبوط پشتوں سے ساحل کو سیلاب کی لہروں سے محفوظ کر دیا گیا ہے، کلب گھر، چائے خانے، بچوں کے کھیلنے کے لئے طرح طرح کے جھولے نظر آئے، پانی تک پہونچنے کے لئے خوبصورت زینے بنے ہوئے تھے، دریا میں طرح طرح کے بجرے اور کشتیاں دور دور تک متحرک دکھائی دے رہی تھیں جن پر لوگ رنگ رلیاں منا رہے تھے، عورتوں اور مردوں کے رنگا رنگ لباس سے پورا ساحل تصویر خانہ بنا ہوا تھا، ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزیں مل رہی تھیں، چینل کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ بظاہر سمندر معلوم ہو رہا تھا، اسی سے دریائے ٹھیمس نکل کر وسط لندن سے گزرتا ہے، اس ساحل کی خوبصورتی دیکھکر خیال آیا کہ بنارس ہندوؤں کی مقدس جگہ ہے، ان کے پاس دولت کی کمی کسی زمانہ میں نہیں رہی، وہ چاہتے تو بنارس کے گھاٹ کو اسی طرح دلکش بنا سکتے تھے، مگر انھوں نے کبھی یہ نہیں چاہا، اس لئے یہ اب تک ویسے ہی ہیں جیسے پراچین ہندوستان میں رہے ہونگے، اسی لئے اس کے نہ اچھے گھاٹ ہیں، نہ اچھے زینے ہیں، اور

نہ اچھی کشتیاں اس کے پوتر پانی میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں، یہ خیال کرکے زندگی کی ہر قسم کی رعنائی اور دل آویزی سے لطف اٹھانے میں انگریزوں کی خوش سلیقگی کو خراج ادا کرنا پڑا۔ واپسی میں ہم لوگ ساوتھ اکونڈن کے اسپتال میں اتر گئے، یہاں میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محمد شمیم کے لڑکے جاوید شمیم ہیں، جن سے تھوڑی دیر تک گھریلو گفتگو رہی، پھر انھوں نے مغرب کی نماز کے لئے جانماز بچھائی، نماز پڑھ کر ہم لوگ واپس ہوئے، یہ اسپتال بہت ہی سنسان جگہ پر ہے۔

میڈم ٹساؤ میوزیم | پہلی ستمبر کو ہم لوگ میڈم ٹساؤ میوزیم دیکھنے گئے، جو لندن کی عجیب وغریب چیز ہے، یہاں تماشائیوں اور سیاحوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، میڈم ٹساؤ کو موم کے پتلے بنانے میں بڑی مہارت تھی، جن کو وہ اس طرح بنا دیتیں کہ معلوم ہوتا کہ وہ زندہ اور جیتے جاگتے ہیں، وہ خود تو مر چکی ہیں، مگر ان کا یہ آرٹ زندہ ہے، اس میوزیم کی مصنوعی نوعیت کو سمجھتے ہوئے ہم بعض پتلوں کو زندہ سمجھ کر ان کی طرف بڑھے، مگر پھر فریب نظر کا احساس ہوا، دنیا اور خصوصاً انگلستان کی جتنی مشہور شخصیتیں ہیں، سب کے پتلے دکھائی دیئے۔ گاندھی جی اور اندرا گاندھی کے پتلے بھی تھے، ایسا معلوم ہوا کہ ہم واقعی ان کے بغل میں کھڑے ہیں، مجھکو زیادہ دلچسپی انگلستان کے بادشاہ بادشاہ، ہنری ہشتم کے پتلے سے ہوئی جس کے ساتھ ان کی چھ بیویوں کے بھی پتلے تھے، خیال آیا کہ اس تاریخی حقیقت کے باوجود ہمارے فرنگی مورخین مسلمان حکمرانوں کے حرم کو مطعون کرنے میں بالکل نہیں جھجکتے، رومن امپائر میں تو کثرت ازدواج کی مثالیں بہت ملتی ہیں، اس کے شہنشاہ Valentinian نے تو قانون نافذ کر دیا تھا کہ اس کی رعایا میں کوئی چاہے تو زیادہ سی زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ سینٹ اگسٹائن نے تو اعلان کر رکھا تھا کہ عیسائی مذہب میں کثرت ازدواج کوئی جرم نہیں، فرانس کے شہنشاہ شارلیمین کے محل میں نو بیویاں ایک ساتھ تھیں۔

عبدالرحمٰن بزمی صاحب | ۲؍ ستمبر کو جناب عبدالرحمٰن بزمی صاحب قیامگاہ پر ملنے آئے اپنے گھر سے

کافی مسافت طے کرنے کی تکلیف گوارا کی، ان کا اصلی وطن تو لاہور ہے، لیکن ان کے خاندان والے پہلے مشرقی افریقہ گئے، پھر جنوبی افریقہ منتقل ہو گئے، وہیں سے آکر لندن میں گذشتہ دس سال سے ملازمت کر رہے ہیں، سیمنار کے دوران سرسری ملاقات ہوئی تھی، برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے ساتھ گھر پر مدعو کیا تھا، لیکن جا نہ سکا تھا تو پھر میری قیامگاہ پر ملنے آگئے، جس کے لئے ان کا ممنون ہوا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑے قدرداں ہیں، علامہ شبلیؒ کی تصانیف پڑھی ہیں، سر سیدؒ اور علامہ شبلیؒ کے جو اختلافات تھے، ان سے بھی واقف تھے، تعجب یہ ہوا کہ مولانا عبدالسلام ندوی پر شبلی کالج نے جو نمبر نکالا تھا، اس کو بھی پڑھا تھا، تقریباً پانچ گھنٹے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ہر موضوع پر وہ تیار نظر آئے، مولانا مودودی کے بڑے معتقد ہیں، کہنے لگے کہ ان کا نکاح انہی نے پڑھایا تھا، وہ مجھ سے ایسے گھل مل گئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کی ملاقاتیں ہیں، شاعر بھی ہیں، یہاں کی ادبی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے ہیں، ایران کے انقلاب پر گفتگو آئی تو پاکستان کے اخبار "جسارت" کے اڈیٹر صلاح الدین صاحب نے جو کتاب "ایرانی انقلاب کیا کھویا کیا پایا" لکھی ہے، اس کا ذکر آیا، ان کے پاس یہ کتاب تھی، انھوں نے گھر جا کر یہ کتاب ڈاک سے بھیجی، اور اپنی کچھ نظمیں بھی ارسال کیں، جن کے عنوانات یہ تھے "صلّ علیٰ محمدؐ" "اتحاد" "قائداعظم" اور حسن مثنی، پہلی نظم کا ایک بند یہ ہے:

جلوہ فشاں ہے ہر طرف تیرے کرم کا آفتاب
تیری نوازشوں سے ہیں اپنے پرائے فیضیاب
بزمیِ کمترین کو ایک نسبتِ بندگی تو ہے
حضرتِ ابن عوفؓ کے نام کا فخر انتساب
صلّ علیٰ شفیعنا صلّ علیٰ محمد

ایرانی انقلاب | پاکستان میں صلاح الدین صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، اس لئے انکی

کتاب "ایرانی انقلاب کیا کھویا کیا پایا" کو بہت شوق سے ایک نشست میں پڑھ گیا، اس کے کچھ اقتباسات یہاں پر درج کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مصنف فروری ۱۹۸۲ء میں ایران کے تین سالہ جشن انقلاب میں شریک ہوئے تھے، وہاں سے آکر یہ کتاب لکھی، جس میں ایران کے موجودہ انقلاب کا بڑا اچھا تجزیہ ہے، اس کے دو پہلو ہیں، پہلے میں مداحانہ اور دوسرے میں ناقدانہ تبصرے ہیں۔

اس کا اعتراف فراخدلی سے کیا گیا ہے کہ انقلاب کا پورا خمیر توحید اور اسلام کو ایک مکمل نظام کی حیثیت سے نافذ کرنے کے عزم سے اٹھا، اس کی قوت محرکہ محض معاشی مفادات نہیں تھے، ایمان کے سرچشمے سے یہ قوت ابھری، اور اس نے اس مادیت کے دور میں مادی وسائل پر ایمان کی برتری کا لوہا منوایا، اس کے بعد جو دستور بنا اس میں یہ بات صراحت سے بیان کر دی گئی ہے کہ یہ نظام عقیدۂ توحید، قرآن اور سنت پر مبنی ہوگا، سنت میں بارہ اماموں کی روایات بھی شامل رکھی گئیں، اس نظام کا اصطلاحی نام ولایت فقیہ رکھا گیا ہے، اور اس وقت زندگی کے ہر شعبہ کی سربراہی فقیہ کے ہاتھ میں آگئی ہے، دیہات کی کونسلوں سے لے کر مرکزی مجلس اور مملکت کے اعلیٰ ترین عہدے تک ہر جگہ اقتدار کی باگ ڈور فقیہ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے ساتھ اور تمام اداروں کا کنٹرول نوجوانوں کے سپرد کر دیا گیا ہے، کیونکہ انقلابِ ایران کی اصل قوت نوجوان طلبہ ہی ہیں، اس نظام سے طہران شراب، جواخانوں، قحبہ گری کے اڈوں اور مغربی دنیا کے جملہ خرافات سے بالکل پاک ہو گیا ہے، آرائش جمال سے لپی ہوئی عورتیں سڑکوں پر سے بالکل غائب ہو گئی ہیں، تمام عورتیں چادر اور برقعہ کی پابند ہیں، صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول میں ہزاروں لڑکیاں چادروں میں ملبوس سڑکوں اور بازاروں میں نظر آتی ہیں، ہزاروں نوجوان ان کے گرد موجود ہوتے ہیں، لیکن اخلاق سے گرا ہوا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوتا، ایک نے اپنے گرد حیا کا حصار قائم کر لیا ہے تو دوسرا اس حصار کا نگہبان نظر آتا ہے، چادر اور چار دیواری کی حفاظت کیسے

ہوتی ہے، اس کا حقیقی مفہوم ایران جا کر دیکھا جا سکتا ہے، انقلاب سے پہلے مختلف طبقات کے تہذیبی دائرے الگ الگ تھے، اب یہ سب ٹوٹ پھوٹ کر ایک ہی رنگ میں رنگ گئے ہیں، نئی ابھرتی ہوئی تہذیب پر اسلام کا گہرا رنگ غالب ہے، چھوٹے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ سب ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں، پست کو بلند اور بلند کو پست کر کے ایک دوسرے کے قریب کر دیا گیا ہے، ذی حیات مجسمہ سازی ممنوع قرار دیدی گئی ہے، اس کی جگہ پر قرآنی آیات کے کتبے دلکش انداز میں لکھے جانے لگے ہیں، آرٹ اور ادب کی اباحیت پسندی نظر نہیں آتی، تعلیم کے شعبے میں طبقاتی ادارے ختم کر کے تمام مدارس کو ایک ہی نصاب کے تحت تعلیم دینے کی راہ پر لگا دیا گیا ہے، اب امیر اور غریب ساتھ بیٹھ کر پڑھتے ہیں، اور ایک ہی قوم کے افراد ہونے کا احساس ابھر رہا ہے، دیہات میں تعمیری سرگرمیوں کے لئے ایک علیحدہ تنظیم قائم کی گئی ہے جس کا نام جہاد سازندگی ہے، اس کے ذریعہ وہاں غسل خانے، طبی مراکز، مساجد، چشمے، طہارت خانے، پختہ مکانات، آبی راستے، اسکول، کنوئیں، نل، زرعی مشین، بجلی، کھاد، جراثیم کش ادویات، کتب خانے سب نظر آنے لگے ہیں، اس تنظیم کا سارا بوجھ نوجوانوں کے سر ہے، جو حسب ضرورت بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ رضاکارانہ خدمت انجام دیتے ہیں، کسانوں میں زمین اس بنیاد پر تقسیم کی گئی ہے کہ یہ اللہ کی ملکیت ہے، غیر محدود زمین رکھنے کا حق باقی نہیں رہا، مزدوروں کی تنظیم کے لئے ایک مجلس شوریٰ اور دوسری اسلامی انجمن بنا دی گئی ہے، تاکہ کمیونسٹوں کا اثر ان پر نہ ہو، مزدوروں کی کم سے کم تنخواہ تین ہزار تومان مقرر کی گئی ہے، اسلامی انجمن ان پڑھ مزدوروں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی ہے، انھیں مذہبی تعلیم بھی دیتی ہے، تمام بینکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے، رشوت، خورد برد، سرکاری ٹھیکوں میں دھاندلی، قحبہ گری اور دوسری ناجائز صورتوں سے حاصل کی ہوئی املاک بحق سرکار ضبط کر لی گئی ہیں۔

اس کتاب میں انقلاب کا دوسرا رخ بھی پیش کیا گیا ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں، اس انقلاب

کے بہت بڑے حامی بازرگان، ابراہیم یزدی، قطب زادہ اور علی رضا نوباری تھے، امام خمینی نے ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا تھا، لیکن آج یہ سب ان کے مخالفین میں سے ہیں، علی رضا نوباری کو امام خمینی نے ۱۹۷۹ء میں مرکزی بینک کا گورنر بنا دیا تھا، لیکن ان سے جلد اختلاف ہوگیا، وہ امریکہ کے سفارت خانہ کے عملہ کو یرغمال بنانے کے حامی نہ تھے، کیونکہ جب عملہ کو یرغمال بنایا گیا تو امریکہ نے اپنے یہاں ایران کے سرمایہ کو منجمد کر کے اربوں ڈالر کا نقصان پہونچایا، جس کے بعد ایران کے سکہ کی قیمت بھی عالمی بازار میں بہت گر گئی، ملک کی معیشت بگڑ گئی، مہنگائی بڑھ گئی، بے روزگاروں کی تعداد چالیس لاکھ تک پہونچ گئی، کارخانے بند ہو گئے، ان باتوں کے علاوہ انقلاب کے بعد علماء نے اسلامی معاشیات کی ایرانی تنظیم کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا، تو اسلام بینک قائم کر کے اپنے نام سے بڑی بڑی رقمیں حاصل کرنے میں لگ گئے، ایک عالم کے نام تین کروڑ ڈالر بینک میں جمع پائے گئے، یہی علماء امراء کے مکانات نصف قیمت پر اپنے لئے خریدنے لگے، راشن کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا تو انھوں نے اس سے ہر قسم کے ناجائز فوائد اٹھائے، عراق سے جنگ کی وجہ سے تیل کی تجارت پر بھی اثر پڑا، اس کی مانگ کم ہوگئی،

نوباری ان الزامات کے ساتھ امام خمینی پر یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ امام خمینی شاہ ایران کے دور میں لوگوں کو گولی سے اڑانے کی شدید مذمت کیا کرتے تھے، لیکن اب اس پر خود عمل کر رہے ہیں، ان سے اختلاف رائے کر کے ایران میں زندہ رہنا مشکل ہے، ان سے اتفاق اور اختلاف ایمان و کفر کا مسئلہ بن گیا ہے، نوباری کا یہ بھی اعتراض ہے کہ امام خمینی پیرس میں برابر اعلان کرتے رہے کہ وہ براہ راست سیاست میں حصہ نہیں لیں گے، ایک سرپرست کا کردار ادا کرتے رہیں گے، لیکن انقلاب کے بعد وہ ایران کے اصل حکمراں ہیں، پوری سیاسی قوت ان کے ہاتھوں میں مرتکز ہے، نوباری کا یہ بھی خیال ہے کہ کمیونسٹوں کی تودہ پارٹی حکومت کے اندر گھل مل گئی ہے، آئندہ جو صورت حال پیش

آنے والی ہے، اس کا فائدہ روس اٹھائے گا، بلکہ روسیوں کو یہ یقین ہے کہ خمینی کے بعد ایران انکے قبضہ میں ہوگا۔

صلاح الدین صاحب نے نوباری کے اعتراضات کے ساتھ کچھ اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت تک انقلاب کی نفسیاتی کیفیت پر جذباتیت اور جبر کا دباؤ پڑ رہا ہے، اور جذبات کی سولی پر ٹنگا ہوا ہے، امام خمینی نفرت اور خوف کے جذبات کو غیر ضروری طور پر برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، خوف نے خود امام خمینی کو اپنا قیدی بنا لیا ہے، وہ آج اپنی مفتوحہ مملکت میں ہزاروں مسلح پاسبانوں کے حفاظتی حصار میں بند ہیں، ان کی طبیعت کا یہ رنگ ہے کہ وہ بارود بن کر دشمن کا قلعہ اڑاتے ہیں، پھر دوسرے دشمن کے قلعہ کی تلاش کرتے ہیں، انھوں نے اپنے پیروکاروں کے لئے محاذ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک مصروف جہاد رہیں، تب بھی ان کی فتوحات کا سلسلہ ختم نہ ہوگا، قصر شاہی کو فتح کرنے کے بعد انھوں نے امریکی سفارتخانہ کو اپنا ٹارگٹ بنایا، عراق ان کی سرحد میں اپنی حماقت سے گھس آیا تو ان کو تیسرا ٹارگٹ میسر آگیا، وہ مصالحت اور مفاہمت کا کوئی فارمولا قبول نہیں کرتے، وہ سمجھتے ہیں کہ عراق سے جنگ انکی بھی اپنی ضرورت ہے، یہ محاذ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، تو ان کو کوئی اور محاذ تلاش کرنا ہوگا، شاید اسی خیال سے عراق کے علاوہ مصر، سعودی عرب، اردن اور دوسرے ممالک میں انقلابات برپا کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

صلاح الدین صاحب کی رائے ہے کہ امام خمینی اس وقت بیرون بینی کے بجائے اگر درون بینی پر زیادہ توجہ دیں، تو شاید ان کا انقلاب زیادہ مستحکم اور نتیجہ خیز ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جذبات کی دہکتی ہوئی آگ سے گھر پھونک تماشہ دیکھنے کا موقع آجائے، کیونکہ معیشت کا جو ڈھانچہ بگڑ گیا ہے اس کے جانبر اور توانا ہونے کے ابھی آثار نہیں۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میدان آزادی کے مجمع سے اصلی صورت حال کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا
کیونکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کتنی رضا کارانہ ہے، اور کتنی بس
خوف سے آئی ہے کہ کہیں وہ انقلاب کے مخالف نہ سمجھے جائیں۔

وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ علماء کے ہاتھ میں راشن کارڈ دینے کے فیصلہ سے ہر محلہ کے لوگوں
کو علماء کے بالمقابل کھڑا کردیا گیا ہے، اس سے جو نفرت اور خرابی پیدا ہوگی، اس سے کمیونسٹوں کے ہاتھ
مضبوط ہوں گے۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ امام خمینی کی عقیدت سے شخصیت پرستی کا جو جنون پیدا ہوا ہے، وہ اسلام
کی روح سے ہم آہنگ نہیں، انھوں نے تو امام مہدی کی صورت اختیار کرلی ہے، قرآن مجید کے بعد
امام خمینی ہی کے اقوال ہر جگہ لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، حضور اکرم صلعم کی کوئی ایک حدیث کہیں لکھی ہوئی
نہیں دیکھی جاتی۔

انھوں نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ علماء کو سیاسی اور معاشی نظام میں شریک کرکے
بڑا خطرہ مول لیا گیا ہے، اگر وہ ناکام رہے تو ان سے عوام کی عقیدت بہت دنوں کے لئے ختم ہوجائیگی،
ان علماء نے نہ صرف یورپ اور امریکہ بلکہ عرب دنیا سے اپنے تعلقات بگاڑ لئے ہیں، جس سے ایران
کو یکہ و تنہا ملک بنادیا ہے،

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انتخابات ہوئے تو کردستان اور ایرانی بلوچستان کی سنی اکثریت
کے علاقوں کو ان میں شامل نہیں کیا گیا ہے، اور یہ علاقے منتخب اداروں میں نمائندگی سے محروم
رہے، تہران میں سنیوں کو کم از کم ایک مسجد بنانے کی اجازت دیدی جاتی تو شیعہ سنی اتحاد کو فروغ
دینے میں بہت مدد ملتی، دستور میں ریاست کا مذہب اسلام شیعہ اثنا عشری عقیدہ کے مطابق رکھا
گیا ہے، سربراہ اور کلیدی عہدوں کے لئے بھی فلسفہ ولایت فقیہ کے تحت شیعہ ہونا ضروری ہے،

کوئی سنی کلیدی مناصب پر فائز نہیں ہوسکتا۔

صلاح الدین صاحب کی اس کتاب کے مطالعہ سے ایران کے انقلاب کو سمجھنے میں بڑی مدد
ملی، اسلام کے نام پر وہاں بہت بڑا انقلاب ضرور آیا ہے، اور ایک مذہبی عالم نے وہاں جو کچھ
کر دکھایا ہے، وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے، اب دعا یہی ہے کہ یہ انقلاب کامیاب
ہو، خدانخواستہ یہ انقلاب آگے چل کر ناکام ہوگیا، تو اس سے دنیا کے سارے مسلمانوں کو جو
نقصان پہونچے گا، اس کی تلافی معلوم نہیں کب ہوسکے گی، اسی لئے اس انقلاب کو دھڑکتے
ہوئے دل کی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

رام فورڈ مارکیٹ ۳۰ اگست کو رام فورڈ مارکیٹ عزیزی محمد فاتح لے گئے، جہاں ایک عجیب
دنیا دیکھی، یہاں خریداروں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ ان کی موٹروں کو پارک کرنے کے لئے کئی منزلوں
کی ایک عمارت بنائی گئی ہے، موٹر کے لئے گیٹ اس وقت تک نہیں کھلتا جب تک ٹکٹ خرید
نہ لیا جائے، ٹکٹ خریدنے کے لئے رقم ایک کونٹر میں ڈالدی جاتی ہے تو ٹکٹ خودبخود نکل آتا ہے اور
پھر پھاٹک بھی خودبخود کھل جاتا ہے، اس کے اندر بڑی بڑی عمارتیں ہیں، جن میں علحدہ علحدہ شاپنگ سنٹر
ہیں، ضروریات کی ساری چیزیں سجی سجائی رکھی رہتی ہیں، ان پر کوئی دوکاندار نہیں ہوتا، خریدار اپنی اپنی
پسند کی چیزیں اٹھالیتے ہیں، اور علحدہ علحدہ کونٹر پر جاکر قیمت ادا کردیتے ہیں، ٹل کے ذریعہ ان کو
بل مل جاتا ہے، یہاں کے لوگوں کی ایمانداری پر اتنا اعتماد ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی چیز اپنی جگہ سے چوری
نہیں ہوسکتی، ہمارے ملک میں نہ یہ ایمانداری اور نہ یہ اعتماد ہے، آم ایک اسٹال پر رکھا ہوا دیکھا
اس پر قیمت ایک پونڈ لکھی ہوئی دیکھی، یعنی ہندوستانی سکہ سے سولہ روپے کچھ آنے۔ لوگ گرانی کا
خیال کئے بغیر ہر چیز خریدتے ہیں، ان میں قوت خرید بہت ہے، سنیچر کے روز اس احاطہ میں خرید و فروخت
کا ایک میلہ بھی لگتا ہے، جس میں ترکاریاں اور پھل وغیرہ انگریز چیخ چیخ کر اسی طرح فروخت کرتے ہیں

جس طرح ہمارے یہاں چیخ چلا کر گاہکوں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، جو ہجوم دیکھا اس سے خیال ہوا کہ روزانہ لاکھوں کا کاروبار ہوتا ہوگا۔ رام فورڈ مارکیٹ سے بھی بڑے بڑے شاپنگ سنٹر لندن میں ہیں، جن میں ہیروڈس نامی مارکیٹ سب سے بڑا ہے، مگر یہاں کی چیزوں کی قیمت بہت زیادہ ہے، ایک بار وہاں جانے کا بھی موقع ملا تھا تو ایک قمیص کی قیمت ایک سو دس پونڈ لکھی ہوئی تھی، معلوم ہوا کہ ملکہ الزبتھ یہیں آکر خریداری کرتی ہیں۔

مڈلینڈ بینک اسی بازار کے پاس مڈلینڈ بینک نامی بینک دیکھا، جس میں کچھ لوگ اپنی پاس بک کا اپنا اکاؤنٹ نمبر اور چک پر رقم لکھ کر کونٹر میں ڈال رہے تھے، اور رقم فوراً باہر نکل آتی، ایسے بینک جابجا قائم ہیں تاکہ لوگ جب چاہیں اپنی ضرورت کے لئے رقم نکال سکتے ہیں، یہ ہر وقت کھلے رہتے ہیں، ایسے بینک سے ایک وقت صرف ایک سو پونڈ نکالے جا سکتے ہیں، یہاں بینک کا کوئی ملازم نہیں ہوتا، بینک کے ایسے کاروبار کو دیکھ کر حیرت ہوئی، اپنا ملک اس سلسلہ میں اور بھی پچھڑا معلوم ہوا۔

ہم وطنوں سے ملاقات اسی دن رات کو عزیزی سراج گیلانی اپنے بھائی اور ماموں زاد بھائی شمیم کے ساتھ قیامگاہ پر ملنے آئے، سراج گیلانی یہاں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ برسوں سے ہیں، ان کے بھائی کچھ کاروبار کرتے ہیں، اور شمیم میاں یہاں سرکاری ملازم ہیں، دیر تک گھریلو باتیں ہوتی رہیں نماز کا وقت آیا، تو ان سبھوں نے نماز پڑھی، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

والتھم اسٹو میں ایک تقریر ۴ر ستمبر کو والتھم اسٹور کی مسجد اقصیٰ میں تقریر کرنے کے لئے لے جایا گیا، پہلے ذکر آیا کہ سیمینار کے آخری روز ایک صاحب ہجوم میں ڈھونڈتے ہوئے میرے پاس آئے، وہ معارف کے قدرداں ہیں، اپنی مسجد میں ایک تقریر کرنے کی دعوت دی گئی، پھر ایک روز قیامگاہ پر آ کر ۴ر ستمبر کی تاریخ بھی مقرر کر گئے، یہ مسجد یہودیوں کی اس عبادت گاہ

کو توڑ کر بنائی گئی، جس کو انھوں نے ۶۷ ہزار پونڈ میں مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا، اس خریداری کے بعد اس کی تعمیر میں ایک لاکھ پچیس ہزار پونڈ صرف ہوئے، اس علاقہ میں زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی تاجروں کی دوکانیں ہیں، ہندوستانیوں میں زیادہ تر گجرات اور بمبئی کے ہیں، جناب محمد یعقوب صاحب برٹش ایسجن کمپنی میں ہیڈ اکاؤنٹنٹ ہیں، وہاں پانچ سو فی ہفتہ ان کی تنخواہ ہے، راندیر کے رہنے والے ہیں، بہت متشرع ہیں، ان ہی نے اور مہمانوں کو دن کا مزیدار لنچ کھلایا، پھر مسجد اقصیٰ لے گئے، جہاں ظہر کی نماز کے بعد مجھکو بولنے کے لئے کہا گیا، سوا گھنٹے بولتا رہا، جس میں دار المصنفین، علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمانؒ ندوی، دار المصنفین کی مطبوعات، لندن میں مسلم انسٹیٹیوٹ کے سیمینار، ایران کے انقلاب، نیشن اسٹیٹ، اسلامی جمہوریت، اخلاق کی پاکیزگی، محاسبۂ نفس، مسلمانوں کے زوال کے اسباب، فرقہ بندی کے نقصانات، اچھے مسلمان کے اوصاف، مسلمانوں کے روشن مستقبل کے آثار وغیرہ سب ہی کا ذکر آیا، حاضرین نے خاموشی سے تقریر سنی، اور کئی صاحبوں کو ٹیپ بھی کرتے دیکھا، میری تقریر کے بعد دو صاحبان امام خمینی پر گفتگو کرنے لگے، ایک کو حامی دوسرے کو سخت مخالف پایا، جو کسی حال میں اس کو اسلامی انقلاب سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے، اس کو ایک شیعی تحریک قرار دیتے رہے، اسی علاقہ میں ایک گھر دکھلایا گیا جس میں پاکستان کا ایک خاندان رہتا تھا، لوگوں نے بتایا کہ ایک سال پہلے گوروں نے رات کے وقت اندر پٹرول چھڑک کر اس میں آگ لگا دی، جس سے مالک مکان کی بیوی اور لڑکی جل کر ہلاک ہوگئیں، خود مالک مکان زخمی ہو کر بچ گئے، یہ نسلی تعصب کی وجہ سے کیا گیا، مگر اب تک پولیس ان شرارت پسندوں کی سراغ رسانی نہیں کر سکی ہے، اگرچہ یہی لوگ یہاں کی پولیس کی خوبی اور شرافت کی تعریف بھی کر رہے تھے، ان کا بیان تھا کہ یہاں کے لوگ پولیس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، ان کی بے عزتی کسی حال میں گوارا نہیں کرتے، ان کے یہاں رشوت ستانی کی کوئی مثال نہیں ملتی، وہ قانون کے مخلص پاسبان اور نگہبان سمجھے جاتے ہیں، گو وہ گوروں اور کالوں کے مقابلہ میں گوروں کی

پاسداری کرتے ہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد اسی رات کو عزیزی فاتح کے یہاں ایک دعوت میں ان کے ہمزلف ڈاکٹر آفتاب اپنی فیملی کے ساتھ آئے، جو امریکہ سے آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ان کے دوسرے ہمزلف ڈاکٹر امان اللہ بھی تھے، ڈاکٹر آفتاب مذہب پر جوشیلی گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے کہ قرآن پاک ہر مسلمان کی میز پر ہونا چاہئے، اسی سے روزانہ ہدایت حاصل کرتا رہے، انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں جو عرب ہیں، وہ اپنی اخلاقی زندگی کے اچھے نمونے پیش نہیں کرتے، ان پر امریکن ہنستے رہتے ہیں، ڈاکٹر امان اللہ نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ لندن میں بھی وہ بدنام ہیں۔

دانتوں کا سٹ ۵/ستمبر کو دندان ساز نے دانتوں کا سٹ بنا کر دیا، قیامگاہ پر واپس آیا تو محسوس ہوا کہ اس کے استعمال سے اوپر نیچے کے مسوڑھے چھل گئے ہیں، اس لیے کچھ کھا نہ سکا، یوں بھی دانتوں کے بغیر غذا کم ہو رہی تھی، جس سے صحت پر اثر پڑ رہا تھا، اسی روز عزیزی فاتح کے ساتھ پیرس کے لئے ویزا لینے کے لئے فرانسیسی سفارت خانہ گیا، لیکن وہ بند ہو چکا تھا، عزیزی فاتح نے ایک بار پھر پارلیمنٹ، بکنگھم پیلس اور ہائڈ پارک کی سیر کرا دی۔

حمید اللہ خاں صاحب سے ملاقات ۶/ستمبر کو حمید اللہ خاں صاحب نکسلے گارڈن سے ملنے قیامگاہ پر آئے، وہ شمال مغربی لندن میں رہتے ہیں، کافی مسافت طے کر کے آئے تھے، ان سے مل کر خوشی ہوئی، حیدرآباد آبائی وطن تھا، یہاں ملازمت کے سلسلہ میں آئے تو اب یہیں کے شہری ہو گئے، یہ معلوم کر کے اور بھی مسرت ہوئی کہ جناب غلام محمد صاحب مصنف تذکرہ سلیمان کے ہمزلف ہیں، ان سے چھ گھنٹے ملاقات رہی، دارالمصنفین، حضرت سید صاحبؒ اور معارف کے بہت قدرداں تھے، ۲۱-۱۹۲۰ء کے معارف کے پرچے بھی ساتھ لائے تھے، دارالمصنفین، علامہ شبلیؒ، سید صاحبؒ، اقبالؒ، جامعہ عثمانیہ، سقوط حیدرآباد، قاضی عبد الغفار، عثمان علی خاں، تصوف، صوفیائے کرام، اسلامک کلچر، دائرۃ المعارف،

انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر عبد الحق، اور لندن کی زندگی وغیرہ پر دیر تک گفتگو ہوئی، ان کی شرافت طبع سے متاثر ہوا، میرے قیام کے زمانہ میں ٹیلیفون پر برابر گفتگو کرتے رہے۔

عزیزی فاتح کی سرجری عزیزی فاتح کی سرجری یعنی مطب میں کئی بار جانے کا اتفاق ہوا، مگر ایک دو دن اس خیال سے گیا کہ یہاں کے مریضوں کے عادات و اطوار کا مطالعہ ہو سکے، وہ آتے ہیں، تو اپنا نام Recepti onist کے رجسٹر میں درج کرا دیتے ہیں، پھر ایک کمرہ میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کی تعداد کتنی بھی ہو، کمرے میں خاموشی چھائی رہتی ہے، کوئی کسی سے گفتگو نہیں کرتا، وہ صحیح معنوں میں اس کے نمونے ہوتے ہیں کہ Patient is Batient Receptionist ایک ایک کا نام پکارتی ہے تو وہ اٹھتے ہیں اور ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے ہیں، ان کو کوئی فیس ادا کرنی نہیں ہوتی، کیونکہ ڈاکٹر کو حکومت کی طرف سے اسی لئے تنخواہ ملتی ہے کہ وہ اپنے حلقہ کے مریض کو دیکھا کریں، ضرورت ہوتی ہے تو یہی ڈاکٹر ان کے گھر پر جا کر بھی دیکھ بھال کرتا ہے، خصوصاً بوڑھوں اور بوڑھیوں کے علاج کا تو وہ پورا ذمہ دار ہو جاتا ہے، اگر ان کا علاج پیچیدہ ہو جاتا ہے تو یہی ڈاکٹر اسپتال میں لے جا کر ان کو وہاں داخل کر دیتا ہے، دوائیں حکومت کی طرف سے تقریباً مفت ملتی ہیں، جن کے لئے مخصوص دوکانیں ہر علاقہ میں ہوتی ہیں، کمرہ کے اندر دیواروں پر ہر مرض کے لئے کچھ نہ کچھ ہدایت لکھی ہوئی تھی، سگریٹ نوشی کے خلاف مہم جاری ہے، اس لئے اس کی ضرر رسانی کی بھیانک تصویریں لگی ہوئی تھیں، مگر عجیب بات دیکھنے اور سننے میں آئی کہ مردوں نے زیادہ تر سگریٹ پینا چھوڑ دیا، مگر ان کے مقابلہ میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ پینے لگی ہیں، اس سرجری میں ایک چھوٹے سے واقعہ سے بہت متاثر ہوا، ایک خاتون اپنی دو برس کی بچی کے ساتھ بیٹھی تھی، بچی کے بہلانے کے لئے دو تین چاکلیٹ دیئے، بچی نے چاکلیٹ کے کاغذ کو اتارا تو اس نے اس کے ٹکڑے کو پہلے ایک میز پر رکھا، اس پر گرنے نہیں دیا، جب چاکلیٹ کھا چکی تو اٹھ کر کاغذ کے ٹکڑوں کو ردی کے بکس میں ڈال آئی، صفائی

کی خاطر اس تربیت کو دیکھکر خیال ہوا کہ اس قوم کو زندگی بسر کرنے کا جو سلیقہ ہے، وہ ہم ہندوستانیوں کو کہاں سے آسکتا ہے، ہم گندگی کو گندگی سمجھنے سے قاصر ہیں،

ڈاکٹر محمد عزیر کا اصرار میرے ہموطن عزیزی ڈاکٹر محمد عزیر بریڈفورڈ میں ڈاکٹر ہیں، مجھ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، ان کا برابر اصرار رہا کہ میں ان کے یہاں آؤں، ایلکس سے وہ تین سو میل کے فاصلے پر تھے، اکیلے وہاں جا نہیں سکتا تھا، کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں تھا۔

ڈاکٹر نثار احمد یہ نیو کاسل میں رہتے ہیں، بہار کے رہنے والے ہیں، بیس برس سے لندن میں ہیں، دار المصنفین سید صاحب اور معارف کے قدرداں ہیں، ان کا بھی اصرار رہا کہ میں ان کے یہاں آؤں، یا کم از کم ڈاکٹر محمد عزیر کے یہاں ضرور آجاؤں، یہ ممکن نہ ہوسکا وہ برابر ٹیلیفون پر علمی اور مذہبی گفتگو کرتے رہے، ان کی فرمائش تھی کہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب کی تعلیم الاسلام کی جلدوں کا ترجمہ انگریزی میں کر دوں، تاکہ انگلستان میں رہنے والے مسلمان بچے ان سے استفادہ کریں اور وہ مسلمان بنے رہیں، ان کی خواہش یہ بھی تھی کہ بہشتی زیور کا بھی ترجمہ انگریزی میں ہو، مولوی عتیق سنبھلی نے بتایا کہ ان دونوں کتابوں کے ترجمے انگریزی میں ہوچکے ہیں،

فرانسیسی سفارت خانہ ۶ ستمبر کو عزیزی فاتح کے ساتھ فرانسیسی سفارت خانہ پیرس کا ویزا لینے گیا، درخواست دینے کے لئے چار فوٹو کی ضرورت تھی، ایک شاپنگ سنٹر میں جا کر کچھ سکے ایک کونٹر میں ڈالے تو پانچ منٹ میں چار فوٹو نکل پڑے، یہ درخواست لے کر فرانسیسی سفارت خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ویزا ملنے میں کچھ ہفتے لگ جائیں گے، مایوسی ہوئی، اب زیادہ دنوں تک قیام کا ارادہ نہ تھا۔ (باقی آئندہ)

بزمِ صوفیہ

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے ممتاز صاحب تصانیف صوفیۂ کرام و مشائخ عظام کے مستند حالات، تعلیمات اور ملفوظات پیش کئے گئے ہیں

(مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن) قیمت ۰۰—۲۵

وفیات

معین الدین حارث

از، جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب پٹنہ،

۳۱ جولائی ۱۹۸۳ء کو بمبئی میں معین الدین حارث کا انتقال ہوگیا۔ ان کا ماتم سیاسی، تعلیمی اور سماجی حلقوں میں منایا گیا۔ دلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی درسگاہیں بند ہوگئیں، شریف آف بمبئی نے شہریوں کی جانب سے تعزیتی جلسہ طلب کیا، سابق وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی، اشوک مہتا، ایس۔ پی۔ گودریج، پروفیسر مدھو ڈنڈوتے۔ میئر آف بمبئی اور دوسرے مقررین نے خراج عقیدت پیش کیا۔ بمبئی میونسپل کارپوریشن اور کئی دوسرے اداروں نے تعزیتی قرارداد منظور کرکے اپنے اجلاس ملتوی کر دیئے۔ جہاں تک انجمن اسلام کا تعلق ہے (جس کے حارث صاحب کئی سال سے صدر ہوتے چلے آرہے تھے) اس پر تو گویا یتیمی چھا گئی۔ یہ سب کچھ ایک ایسے آدمی کے لیے ہوا۔ جس نے زندگی بھر دوسروں کو دیا۔ خود کچھ نہیں لیا۔

معین الدین حارث، بمبئی کے مضافاتی علاقہ نالا سوپارہ کے رہنے والے تھے، جہاں کوکنی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ بچپن سے سیاسی تحریک سے دلچسپی رہی سرکاری اسکول کی تعلیم ترک کرکے قوم کی طرف سے کھولے گئے اسکول میں داخل ہوئے اور جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو وہاں چلے گئے۔ اور ۱۹۲۷ء میں بی۔ اے کیا، خوش قسمتی سے

انھیں مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم جیراجپوری مولانا سورتی، خواجہ عبدالحئی فاروقی اور کیلاٹ صاحب جیسے مخلص، بلند کردار اور علم وفضل کے درخشندہ ستارے، استاد ملے، جن کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کا رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ تا دم حیات قائم رہا۔

بی۔ اے۔ کر لینے کے بعد حارث صاحب نے بمبئی میں اجمل پریس قائم کیا اور روزنامہ اجمل جاری کیا جو سالہا سال ان کی ادارت میں چلتا رہا۔

بمبئی میں میونسپل کارپوریشن لیجسلیٹو کونسل، مرکزی حج کمیٹی، بمبئی یونی ورسٹی کی سینیٹ اور کئی دوسرے اہم اداروں کے رکن رہے۔ اور ان کے جلسوں میں پابندی سے حصہ لیتے رہے۔ وہ ان کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔

حارث صاحب کو دارالمصنفین سے قلبی لگاؤ تھا۔ یہاں کے کاموں کی وہ بڑی قدر کرتے تھے ۱۹۷۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ ان دنوں دارالمصنفین کی مالی پوزیشن کافی کمزور ہو گئی تھی۔ لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ اہل ثروت کے سامنے دست سوال پھیلایا جائے۔ اس کے بجائے یہ طے پایا کہ ادارے کے دستور کے مطابق اس کے قدر دانوں سے ایک ہزار روپئے لے کر ان کو رکن دوامی بننے کی ترغیب دی جائے۔ تاکہ کچھ رقم یکمشت جمع ہو سکے اور رسالہ معارف اور یہاں کی مطبوعات ان ارکان کو تاحیات ملتی رہیں۔ مجلس منتظمہ کے اجلاس کے دوسرے دن دارالمصنفین سے آئے ہوئے مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی گئی، اس میں شہر بمبئی کے اہل علم اور دانشور بھی موجود تھے۔ راقم نے اپنی تقریر میں رکن دوامی کی تجویز اور دارالمصنفین کی ضرورتوں پر روشنی ڈالی۔ اپیل پر لبیک کہنے والوں میں معین الدین حارث پیش پیش تھے۔ اور اس طرح دارالمصنفین ایک دشوار گزار موڑ سے نکل آیا۔

حارث صاحب کو مطالعے سے بڑا شغف تھا۔ دارالمصنفین کی مطبوعات کا ایک ایک لفظ بڑے شوق سے پڑھتے اور ملاقات ہونے پر ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرماتے، قرآن مجید کا مطالعہ پابندی سے کرتے اور اس کی گہرائیوں پر غور فرماتے۔

حارث صاحب نے اپنی ساری زندگی، ملک وملت کی خدمت میں صرف کی انکی سادگی اور زندگی کے علائق سے بے نیازی حیرت انگیز درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اردو، انگریزی، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں بڑی روانی سے تقریر کرتے جوش اور ولولے کے ساتھ وہ اپنے اعلیٰ خیالات اور افکار سے سامعین کو متاثر کرتے تھے۔

حارث صاحب بے باک صحافی اور نڈر سیاسی مجاہد تھے، جو اپنی صاف گوئی کو مصلحت کے پردے میں چھپانا نہیں جانتے تھے بچپن سے قومی تحریکوں سے منسلک رہے۔ کانگریس، خلافت سوشلسٹ پارٹی۔ پی۔ ایس۔ پی ان سب میں انکا کردار پُر وقار رہا۔ عمر کے آخری حصے میں عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور اپنا سارا وقت تعلیمی اور سماجی خدمتوں میں صرف کرتے رہے ان کی موت بھی کچھ غیر معمولی طور پر واقع ہوئی۔ ایک دوست کے گھر کسی تقریب میں شریک ہوئے، وہاں احباب اور عزیزوں کے ساتھ ہنستے بولتے رہے تھوڑی تکان محسوس ہوئی تو کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ مغرب کی نماز کے لئے لوگ انھیں اٹھانے گئے تو وہ اپنے معبود حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے۔

عربوں کی جہازرانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے وہ اہم معرکۃ الآراء اور پُر از معلومات خطبات کا مجموعہ، جو انھوں نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوشن کی فرمائش پر عربوں کی جہازرانی کے موضوع پر بمبئی کے دانشوروں کے سامنے دیے تھے۔

قیمت ۱۰ روپیے

مطبوعات جدیدہ

قرآن اور دعا مرتبہ مولوی محمد ثناء اللہ عمری، ایم۔ اے، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۶، قیمت بارہ روپے ۱۲، پتہ:۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام، عمر آباد۔

دُعا۔ خدا اور بندے کے رشتہ و تعلق کو جوڑنے اور قریب کرنے کا اہم اور مؤثر ذریعہ ہے، قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے، اور اسے خدا کے مقبول اور نیک بندوں حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کا خاص شعار بتایا گیا ہے، اس لئے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، اردو میں پروفیسر فضل احمد عارف (پاکستان) نے فلسفۂ دعا کے نام سے بہت مفید اور عمدہ کتاب لکھی ہے، اس نئی کتاب میں قرآنی دعائیں اور ان سے متعلق ضروری اور اہم باتیں قرآن مجید ہی کی روشنی میں لکھی گئی ہیں، پہلے دعا کی اہمیت، اس کے شرائط و آداب بیان کئے گئے ہیں، اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ انسانی فطرت کی اصل پکار ہے، اس کے بعد وہ دعائیں نقل کی گئی ہیں جن کے قبول ہو جانے کا قرآن مجید میں اشارتاً یا صراحتاً ذکر ہے، پھر وہ دعائیں مذکور ہیں جو خدا کے برگزیدہ بندوں نے کی ہیں، اسی طرح جن لوگوں کے لئے دعائیں کی گئی ہیں یا جن باتوں کے لئے کی گئی ہیں، ان سب کی تفصیل علیٰحدہ علیٰحدہ عنوانات کے تحت پیش کی ہے، یہ مختلف قسم کی دعائیں عموماً انبیاء علیہم السلام کے حوالہ سے قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں، مرتب نے ان کے نقل میں انبیاء کے زمانے کی ترتیب مدنظر رکھی ہے، اور ہر ہر دعا کا پس منظر بھی بیان کیا ہے جس سے اس کی اہمیت ضمناً ظاہر ہو گیا ہے، دعاؤں کے ساتھ انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوم اور مجرمین کے لئے جو بددعا کی ہے انھیں بیان کر کے ان کی مقبولیت دکھائی ہے، آخر میں دوزخیوں کی اس چیخ و پکار اور دعا کا ذکر ہے، جو وہ جہنم میں کریں گے، لائق مرتب نے اس ضمن میں یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ دعا کی اصل جگہ دنیا ہے، مصنف نے قرآنی دعاؤں ہی پر بحث و گفتگو کی ہے، لیکن ان کی وضاحت میں کہیں کہیں احادیث کی دعائیں بھی نقل کی ہیں اور آیات کی تشریح میں کتبِ تفسیر سے مدد لی ہے، اس سلسلہ میں کہیں کہیں رطب و یابس تفسیری اقوال بھی درج ہو گئے ہیں، انھوں نے استغفار سے متعلق آیتیں بھی تحریر کی ہیں، ایسی صورت میں دعا و استغفار کا فرق بھی واضح کر دینا چاہیئے تھا، آیتوں کا ترجمہ تشریح و ترجمانی معلوم ہوتا ہے، جو احتیاط کے خلاف ہے اور بعض جگہ غلط بھی ہے، مثلاً وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ کا یہ ترجمہ کیا ہے "اور منکرین حق کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ ٹیڑھے رستوں میں بھٹکتے پھرنا" (ص۱۰۱)

بعض جگہ بیجا طوالت اور غیر متعلق بحثیں بھی آگئی ہیں جیسے ذبیح اور حواریین کی تحقیق وغیرہ، سادہ اور سلیس زبان لکھنے کی بجائے کہیں کہیں لفاظی اور عبارت آرائی سے کام لیا ہے، زبان کی غلطیاں بھی ہیں اور بعض لفظوں کا استعمال مناسب اور برمحل نہیں ہے مثلاً "عصمت و عفت کے انتہائی توبہ شکن اور صبر آزما مراحل..." (ص۱۴۶) رہی عبادتیں... (ص۵) سورہ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت پر مولانا آزاد نے اس طرح خامہ فرسائی کی ہے (ص۱۲۸) اہل جنت دوزخ کی ہولناکیاں دیکھکر اس طرح دعا کریں گے، " (ص۱۴۴) یہاں اہل جنت کے بجائے اصحاب اعراف کا ذکر ہے، "قرآن کے دو مقامات پر مقام شہادت کے لئے دعا کی گئی ہے، جو عیسائیوں کی زبان سے نکلی ہے" (ص۱۵۰) اس کے بعد جو دعائیں نقل کی ہیں، وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی ہیں، ان کے لئے "عیسائیوں" کا استعمال پہلی بار دیکھنے میں آیا ہے۔

مجموعۂ وصایا - مرتبہ جناب مولانا افتخار فریدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰ مجلد، قیمت دس روپے، پتہ: عرشی پبلیکیشنز انڈیا، نئی دہلی ۲۔

وصیت کی تاکید اور دینی و شرعی اہمیت کی بنا پر ہمیشہ اہل اللہ، صلحاء اور علماء نے اسے قلمبند کرنے کا اہتمام کیا ہے، جو ان کے تجربات، ہدایات اور نصائح پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہر دور کے لوگوں

کی رشد و اصلاح اور پند و موعظت کا سامان ہوتی ہے، علاوہ ازیں وصیت کی بذات خود غیر معمولی اثر انگیزی، جاذبیت اور کشش بھی عمل کی تحریک اور ولولہ پیدا کرتی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام اور بزرگان دین کی وصیتیں عام کتابوں میں متفرق طور پر ہیں، غالباً مولانا افتخار فریدی کو پہلی مرتبہ ان کا مجموعہ مرتب کرنے کا خیال ہوا، زیر نظر کتاب میں انھوں نے تیس ۳۰ اشخاص کی وصیتوں کو عمدہ ترتیب اور اچھے ڈھنگ سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، اسلام کی دعوت و اشاعت اور امت کی صلاح و فلاح فریدی صاحب کی زندگی کا مشن ہے اور وہ سلف صالحین کی عقیدت و محبت اور تبلیغ کے جذبہ و جوش سے بھی سرشار ہیں، اس لئے یہ مجموعہ خالص دینی و اصلاحی جذبہ سے شائع کیا ہے تاکہ عام مسلمان اپنے اسلاف کی وصیتوں پر عمل کرکے اپنی دنیا و آخرت سنوار سکیں، اس مجموعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے علاوہ امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، شاہ عبد القادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، امام رازیؒ، شاہ اہل اللہؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مرزا مظہر جانجاناںؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شاہ عبد الرحیم رائے پوریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا احمد علیؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور غازی انور پاشا جیسے اکابر علماء اور نامور مشائخ کی وصیتیں جمع کی گئی ہیں۔ زندہ لوگوں میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" اور خود فاضل مرتب کے وصایا درج ہیں، یہ تمام وصیتیں دینی و دنیاوی فوائد پر مشتمل اور بڑی مؤثر اور دلپذیر ہیں، لائق مرتب کے اخلاص، دردمندی، دلسوزی اور جوش تبلیغ نے ان میں مزید کیفیت و حلاوت پیدا کردی ہے، ان کو پڑھکر کتاب و سنت کے اتباع کا داعیہ اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، شروع میں وصیت کی اہمیت و ضرورت اور قرآنی وصایا بھی نقل کی گئی ہیں،

ہندوستان اسلام کے سایے میں مرتبہ مولانا سید عابد علی وجدی الحسینی (قاضی بھوپال)، تقطیع متوسط، صفحات ۳۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپے، پتہ: بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال،

اس کتاب میں ہندوستان سے اسلام کے تعلق کی روداد بیان کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ عرب کے افق پر جب اس کا آفتاب طلوع ہوا، تو اسی زمانہ میں ہندوستان بھی اس کی ضیا بار کرنوں سے منور ہوگیا، اور عہد رسالت ہی میں یہاں کے بعض اشخاص مسلمان بھی ہوگئے، یہ کتاب تین ابواب اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ میں تاریخ نگاری کا مقصد، تاریخ نویسی سے اہل ہند کی عدم دلچسپی، مسلمان مورخوں کی تاریخ ہند کی جانب اعتنا اور انگریزوں کی اس بدباطنی کا ذکر ہے کہ انھوں نے غزنوی اور غوری عہد سے مسلمانوں کے ہندوستان سے تعلق کی ابتدا کا تذکرہ کیا ہے، پہلے باب میں دکھایا ہے کہ ایشیا ہی میں تہذیب و تمدن کی داغ بیل پڑی اور یہ ابتدا سے وحی والہام، دین و مذہب اور علم و فن کا گہوارہ رہا ہے، اسی باب میں دین و مذہب کے نقطۂ آغاز اور اس حیثیت سے مشرق کی مغرب پر برتری کا ذکر بھی ہے، پھر قدیم مشرقی قوموں کی مظاہر و عناصر پرستی کے ضمن میں ہندوستان اور عرب میں چاند اور سورج کی پرستش کا حال تحریر کیا ہے، اس کے بعد اسلام کے ظہور، بعثت محمدی، توحید ربانی کی دعوت اور معجزۂ شق القمر کا ذکر ہے، دوسرے باب میں عرب و ہند کے قدیم تعلق پر روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ اسلام سے پہلے ہی دونوں کے تعلقات کا آغاز ہوچکا تھا، پھر عہد رسالت، عہد صحابہ و تابعین میں تعلقات کی تفصیل پیش کی ہے، اور اس ضمن میں ابتدائی چند صدیوں میں ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ اور متعدد ہندوستانی محدثین اور علماء و صوفیہ کا تذکرہ ہے، آخر میں سرزمین مالوہ میں اسلام کے داخلہ اور راجہ بھوج کے معجزۂ شق القمر کو دیکھکر اسلام لانے کا ذکر ہے، اس باب میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ جنت سے ہندوستان ہی میں اتارے گئے تھے اور یہیں ان کی اور حضرت شیثؑ و حضرت ایوبؑ کی قبریں بھی ہیں، تیسرے باب میں معجزۂ شق القمر پر مفصل بحث و گفتگو ہے، اس

سلسلہ میں معجزہ اور نبوت کی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے، مصنف کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مالوہ میں اسلام کی دعوت عہد نبویؐ ہی میں پہنچ گئی تھی، اور یہاں کا راجہ بھوج معجزہ شق القمر کو دیکھکر مسلمان ہوگیا تھا، لیکن اسے ثابت کرنے کے لئے جو کد و کاوش کی ہے، اس کی حیثیت کوہ کندن کاہ برآوردن کی ہے، اس سلسلہ میں جن واقعات و روایات کو بنیاد بنایا گیا ہے، وہ خود مصنف کے نزدیک عوامی اور خام اور کچے مواد کی طرح ہیں، مگر اس کے باوجود ان پر اتنی عظیم الشان تعمیر کرنا حیرت انگیز ہے، اس قسم کی مختلف و متضاد روایتوں کو شہرت و اعتبار کا درجہ دینا جسارت ہے، مصنف نے نہ اس پر غور کیا کہ جن کتابوں میں یہ روایتیں درج ہیں وہ کس درجہ و پایہ کی ہیں اور نہ یہی دیکھا کہ وہ واقعہ کے کتنے بعد کی لکھی ہوئی ہیں، اگر یہ روایات اتنی ہی مستند اور یقینی ہوتیں تو مصنف کے پیش رو مورخین اور محققین انھیں نظر انداز کیوں کرتے، ایک طرف تو وہ یہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں تاریخ نگاری کا ذوق مفقود تھا، اس لئے یہ واقعہ اہل ہند کی کتابوں میں مذکور نہیں، مگر دوسری طرف یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ راجہ کی بھوج پتری میں اور جنوبی ہند کے راجہ سامری کے روزنامچہ میں تاریخ کے تعین کے ساتھ درج تھا، مصنف نے اپنے مقدمہ میں تاریخ نگاری کے جو اصول بتائے ہیں، انہی کو اگر مدنظر رکھتے تو رطب و یابس اور عوامی روایات سے ثبوت و استدلال پیش کرنے اور افسانہ کو حقیقت قرار دینے کی زحمت نہ گوارا کرتے، انھوں نے معجزہ شق القمر کو جس قطعیت کے ساتھ قرآن مجید سے ثابت کیا ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے ماقبل و مابعد قیامت کا ذکر ہے، کتاب میں جابجا تکرار بھی ہے۔

مبشر علی صدیقی شخصیت و فن۔ مرتبہ ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی و ریندر پرشاد سکسینہ و شمس بدایونی صاحبان، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۸، قیمت پندرہ روپے، پتہ: سلیم مبشر اردو سوسائٹی گلی وحید بخش، محلہ سوتھ، بدایوں۔

جناب مبشر علی صدیقی سے قارئین معارف واقف ہیں، ان کے بعض مضامین کے علاوہ انکی

متعدد کتابوں پر معارف میں تبصرے چھپ چکے ہیں، اب ان کے قدردانوں نے علم و تعلیم کے اس خادم اور اردو زبان و ادب کے عاشق و شیدائی کی ستر ویں برسی کے موقع پر انھیں یہ ادبی تحفہ پیش کیا ہے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، اس میں ان کی سیرت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں کئے گئے ہیں، اور ان کے حالات و کمالات اور تدریسی و تصنیفی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، شروع میں مبشر صاحب کی کتابوں پر مختلف اہل قلم کے مقدمے، تعارف اور پیش لفظ درج ہیں، پھر بعض اصحاب علم نے ان کے نام جو خطوط لکھے ہیں یا دوسروں کو انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں، انھیں شائع کیا گیا ہے، ایک حصہ میں ان کے وہ مضامین شامل کئے گئے ہیں جو ابھی تک ان کی کسی کتاب میں شائع نہیں ہوئے تھے، اس کے بعد ان کے حالات، علمی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں پر چند حضرات کے مضامین اور مبشر صاحب کی کتابوں پر بعض اخباروں اور رسالوں کے تبصرے درج ہیں، آخر میں خود ان کے تبصرے دوسروں کی کتابوں پر دیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب مبشر علی صدیقی صاحب کی شخصیت، حالات اور خدمات کا مختصر مرقع ہے، جو دوسروں کے لئے بھی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

دیوان فدا مرتبہ جناب سید وحید اشرف و مالک رام صاحبان، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۳۴، قیمت پندرہ روپے، پتہ: کلاسیکل لٹریچر کمپنی بک سیلرز نواب باڑہ، بڑودہ، گجرات۔

جناب سید احمد حسن صالحی فدا (متوفی ۱۸۹۴ء) کا تعلق گجرات سے تھا، انھیں شعر و سخن کا ذوق بھی تھا، اور مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرتے تھے، فدا صاحب کے کلام کا بڑا حصہ اس سیلاب میں تلف ہوگیا، جو ۱۹۲۷ء میں بڑودہ میں آیا تھا اور جو کچھ محفوظ رہ گیا تھا، اسے اب ان کے پوتے جناب سید واجد حسین ایگزیکیٹو انجینیر پی۔ ڈبلو۔ ڈی نے بطور یادگار شائع کیا ہے، فدا صاحب کا میلان

مذہب و تصوف کی جانب تھا، اس لئے غزل کے علاوہ انھوں نے نعت و منقبت کی طرف بھی توجہ کی ہے، ان اصناف کے علاوہ متعدد تاریخی قطعات، مثنوی اور قدسی کی مشہور نعت ع

مرحبا سید مکی مدنی العربی

اور جامی کی ایک غزل پر تضمین بھی مجموعہ کے آخر میں شامل ہے، کلام کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے، تاہم اس سے ان کی قدرت اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے، شروع میں جناب مالک رام صاحب اور سید وحید اشرف صاحب کے مقدمے بھی ہیں، اول الذکر نے شاعر کے خاندانی حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور جناب وحید اشرف نے ان کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے عہد بعہد گجرات کی شاعری کا جائزہ لیا ہے، اس سے گجرات کی اردو زبان و ادب کی خدمات کا پتہ چلتا ہے۔

تسنیم و کوثر۔ مرتبہ مولٰنا ابو سلمہ شفیع احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت: دس روپیہ

پتہ: ادارہ ترجمہ و تالیف ۲۸ بھول بگان روڈ. کلکتہ ۲۴۔

سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے اصلاحی و دینی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کے لئے کلکتہ میں ادارۂ ترجمہ و تالیف کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی طرف سے معارف میں کئی کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئی ہیں، جن پر آئندہ ریویو کیا جائے گا، زیر نظر کتاب میں ادارہ کی بعض مطبوعات کے مفید مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف دینی، ملی، قومی، اخلاقی اور اصلاحی عنوانات کے تحت موثر اور سبق آموز مختصر تحریریں شائع کی گئی ہیں، ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۳۲ ماہ صفر و ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء عدد ۶

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمن	۴۰۲-۴۰۴
مقالات		
مستشرقین کے اعتراضات کی نشر و اشاعت کس طرح ہوتی ہے؟	الاستاذ نذیر حمدان، مترجمہ ضیاء الدین اصلاحی	۴۰۵-۴۲۳
بنگال کی پہلی فارسی تالیف	پروفیسر کلیم سہسرامی راجشاہی یونیورسٹی، راجشاہی بنگلہ دیش۔	۴۲۴-۴۳۰
ایک بین الاقوامی سیمینار کے سلسلہ میں لندن کی ڈائری،	سید صباح الدین عبدالرحمن	۴۳۱-۴۷۰
ادبیات		
غزل	جناب قمر سنبھلی (دہلی)	۴۷۱
"	جناب وارث ریاضی مغربی چمپارن۔	"
"	جناب بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ لکھنؤ	۴۷۲
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۴۷۳-۴۸۰